تیرہواں مہمان

تحریر: ژیلہ ظفر

''تو یہ ہے وہ جگہ؟'' میں نے سوٹ کیس گاڑی سے اُتار کر زمین پر رکھتے ہوئے سامنے بنے ہوٹل کو دیکھتے ہوئے، یوسف سے پوچھا تھا۔ درخت کے سوکھے پتےّ سوٹ کیس کے نیچے دب کر چرچرائے پھر خاموش ہو گئے۔

''ہاں! یہی ہے۔'' گاڑی والے کو کرایہ ادا کرتے یوسف نے جواب دیا۔

''دیکھنے میں تو جگہ واقعی آسیب زدہ لگتی ہے۔'' میں نے سامنے کھڑے، کسی پرانی حویلی جیسے اونچے میناروں والے ہوٹل کو دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ اس وادی کے سب سے اونچے پہاڑ کی ٹیلے پر الگ سے بنا ہوا تھا اِسکے آس پاس اور کوئی گھر نہ تھا۔ نیچے تیرہ ہزار فٹ کے قریب کھائی تھی، جس میں چھوٹا سا روشن قصبہ نظر آتا تھا۔ جو کہ فلحال یہاں سے کافی دور تھا۔ شام اختتام کے قریب تھی۔ ہر شے پر نیلاہٹ چھا گئی تھی۔ گو کہ مغرب میں ابھی گھنٹہ باقی تھا لیکن اونچے پہاڑوں پر، گہرے سیاہ بادلوں نے، وقت سے قبل ہی اندھیرا کر دیا تھا۔ ہوائیں تیز تھیں، اور سردی رگوں میں سرایت کر رہی تھی۔

''اب جب تم نے اپنی چھٹیاں برباد کرنے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے، تو یہ سوال بیکار ہے۔'' یوسف نے مسکراتے ہوئے، کچھ دل جلاتے ہوئے کہا۔

''برباد نہیں ہوں گی۔ تم بے فکر رہو۔'' میں نے بھی مسکراتے ہوئے اسے تسلی دی۔ ہوٹل سنسان پڑا تھا، ہر جانب نیم اندھیرا سا تھا۔ ہوا کی رفتار تیز ہوتی جا رہی تھی۔ لگتا تھا جیسے آندھی آنے والی ہو۔

''ہوٹل کا مالک موجود بھی ہے یا نہیں؟'' میں نے اندھیر پڑے ہوٹل کے بند محرابی دروازوں پر نظر ڈالتے ہوئے یوسف سے پوچھا۔

''مالک تو یہیں ہے۔ میں نے اطلاع کر دی تھی کہ آج شام ہم پہنچ جائیں گے۔ اصولاً اسے یہیں ہونا چاہیے تھا۔'' یوسف نے جواب دیا۔ تیز ہوائیں، پتےّ یہاں وہاں اڑانے لگی تھی۔ آسمان پر اب بجلی بھی چمک رہی تھی۔ اس سے قبل کے میں کوئی جواب دیتا، ایک سولہ سترہ سال کا لڑکا دوڑتا ہوا آیا۔

''معاف کیجئے گا، میں ذرا نماز پڑھ رہا تھا اس لیے دیر ہو گئی۔''لڑکے نے آتے ساتھ ہی بنا سلام دعا کے اطلاع دی تھی۔آسمان پر زوردار گرج ہوئی تو دل لمحوں کو سہم گئے۔

''دروازہ جلدی کھول دو، ورنہ میں یہیں کھڑے جم جاؤں گا۔''میں نے کپکپاتے ہوئے کہا۔

''جی بس دو منٹ!''لڑکا جلدی سے محرابی دروازے کی جانب بڑھا، جسکے دو پٹ تھے۔دونوں کو ملا کر کنڈی لگائی گئی تھی۔اور اس پر بڑا سا تالا تھا۔لڑکے نے چابیوں کے گچھے میں سے اپنی مطلوبہ چابی نکالی اور تالا کھولا۔اُسکے بعد وہ پوری طاقت لگا کر بڑی سی کنڈی کھولنے لگا۔آسمان پر گرج چمک تیز ہو رہی تھی، ہوا اب آندھی کی صورت اختیار کر رہی تھی۔

''لگتا ہے کافی عرصے سے بند ہے دروازہ۔''میں نے یوسف کے کان میں سرگوشی کی۔

''ہاں! یہاں کبھی کبھار تمہارے جیسے کوئی سرپھرے آجاتے ہیں، ورنہ ہوٹل بند رہتا ہے۔''یوسف نے کہا۔ اتنی دیر میں لڑکے نے دروازے کی کنڈی کھول لی، پھر قدآدم محرابی دروازوں کو دھکّا لگا کر کھول دیا۔

''آپ لوگ اندر چلے جائیں۔''لڑکا دروازے سے ہٹتے ہوئے بولا۔ تو میں نے اور یوسف نے پہلے ایک دوسرے کا منہ دیکھا، پھر دروازے سے اندر نظر آتے اندھیرے میں گھپ ہوٹل کو۔

''تمہیں یقین ہے کہ ہمیں اندر جانا چاہیے؟''میں نے لڑکے سے پوچھا۔

''آپ لوگ اندر جائیں، ہوٹل کا فیڈر بند ہے۔میں مین فیڈر اُٹھا کر آتا ہوں۔تب تک آپ لوگ یہ ٹارچ رکھ لیں۔''وہ جیب سے ایک چھوٹی سی ٹارچ نکال کر ہمیں دیتا وہاں سے چلا گیا۔

''چلو اندر چلیں!''میں نے یوسف کو کہا اور اپنا سامان گھسیٹے ہوئے اندر کی جانب قدم بڑھا دیے، یوسف بھی یقیناً مجھے دل ہی دل میں کوستا اور دعائیں پڑھتا میرے پیچھے آیا۔ٹارچ کی روشنی میں ہوٹل ہیبت ناک لگ رہا تھا۔نجانے ہم کہاں کھڑے تھے؟البتہ دیواروں پر موجود شیشے کی محرابی کھڑکیوں سے باہر زور سے ہلتے درخت نظر آرہے تھے۔

''یہ ہوٹل انگریزوں کے دور کا بنا ہوا ہے۔ مغلوں کے دور میں یہ ایک حویلی ہوا کرتا تھا، پھر یہاں ک مالک نے اسے ہوٹل کا درجہ دے دیا۔''یوسف نے بتایا۔

''جانتا ہوں یہ بات۔''بجلی زور سے چمکی اور محرابی کھڑکیوں سے راستہ بناتی گلابی روشنی نے لمحوں کے لیے ہال کو روشن کر دیا۔

''سنا ہے انگریزوں کے دور میں یہاں بہت خون خرابہ ہوا تھا۔''یوسف نے بتایا۔

''انگریزوں کے دور میں ایسا بہت سے خاندانوں کے ساتھ ہوا ہے۔ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ لیکن اسکا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم ہوٹل کو آسیب زدہ کہنا شروع کر دیں۔''میں نے بیزاری سے کہا۔ اسی لمحے بادل زور سے گرجے، ہوا کا تیز جھکڑ چلا اور ہوٹل کا قد آدم دروازہ دھاڑ سے بند ہوا۔ ہم دونوں کے دل اچھل کر حلق میں آ گئے۔ اس سے پہلے کہ یوسف چیخنے لگتا، اسی لمحے بجلی کھول دی گئی اور ہوٹل پیلی روشنیوں میں نہا گیا۔

''شکر!''میں نے سکھ کا سانس لیا۔ اور ٹارچ بند کر کے آس پاس نگاہ دوڑائیں۔ ہم ہوٹل کے ہال میں کھڑے تھے۔ ہال کا فرش مضبوط لکڑیوں سے بنا تھا، چھت پر مختلف طرز کے نقش و نگار بنے تھے۔ دونوں جانب دائرے کی صورت دو سیڑھیاں اوپر جا رہی تھیں۔ اوپر پہنچ کر دونوں سیڑھیاں، ایک ریلنگ سے جا کر مل رہی تھیں۔ دونوں سیڑھیوں کے درمیان یہ وسیع ہال تھا، اور ایک جانب ریسیپشن جیسا استقبالیہ تھا۔ اوپر ریلنگ سے آگے دونوں جانب پوری راہداری تھی، راہداری میں قطار در قطار موجود دروازے بند پڑے تھے۔

''مجھے اب تک یقین نہیں آ رہا کہ اس اونچے پہاڑ پر بنا یہ ہوٹل، کسی زمانے میں سیون اسٹار ہوٹل کا درجہ رکھتا تھا۔ اور اب دیکھو!''میں نے خالی پڑے سنسان ہوٹل کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''اُس واقعی کے بعد یہ بند ہو گیا، پھر دوبارہ یہاں کبھی کوئی نہ آیا۔ ورنہ کسی زمانے میں یہاں آنے والوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ بڑی بڑی کاروباری شخصیات یہاں قیام کرتی تھیں۔ پر اُس واقعہ کے بعد اس ہوٹل کا رخ کسی نے نہ کیا۔''یوسف نے کہا۔

''نہیں! پچھلے چند سالوں میں یہاں کچھ لوگوں نے قیام کیا ہے۔''اس آواز پر ہم دونوں نے جھٹکے سے پلٹ کر دیکھا۔ وہ لڑکا جس نے دروازہ کھولا تھا، وہی سامنے تھا۔ لباس گیلا تھا۔ غالباً باہر بارش شروع ہو چکی تھی، اور وہ بھیگ چکا تھا۔

''ہاں! میں نے بھی سنا ہے کہ کچھ لوگوں نے یہاں کا رخ کیا تھا۔''میں نے لاپرواہی سے کہا۔

''کچھ لوگوں نے نہیں، پورے بارہ لوگ تھے۔''اس نے عجیب پراسرار سے لہجے میں کہا تھا۔ پیلی روشنیوں میں یہ ہوٹل اور ہیبت ناک لگ رہا تھا۔

''چھوڑو ان سب باتوں کو، یہ بتاؤ، ہوٹل کا مالک کہاں ہے؟''میں نے موضوع بدلا۔

''وہ کسی کام سے قصبے سے باہر گئے ہیں۔ صبح واپسی ہو گی لیکن صاحب! آپ موضوع نہ بدلیں۔''اُسکے پراسرار سے لہجے پر ہم دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

''میں نے موضوع نہیں بدلا ہے۔''میں نے وضاحت دی۔ آسمان پر بادل دھماکوں کی صورت گرج رہے تھے۔ تیز ہوا سے کھڑکیوں کے پٹ کھل بند ہو رہے تھے۔

''جناب! آپ نے یہاں آ کر اچھا نہیں کیا۔ آپ کو صبح ہونے سے پہلے یہاں سے نکل جانا چاہیے۔''لڑکے نے کہا، اس مرتبہ اُسکے لہجے میں خوف تھا۔

''کیوں؟''میں نے سر تا پاؤں اسے گھورا۔ یقیناً وہ بھی قصبے کے لوگوں کی طرح کوئی فضول سا قصّہ سنانے والی تھا۔

''آپ سے پہلے، بارہ لوگ، بارہ مختلف موقعوں پر یہاں ٹھہرے تھے۔ وہ سب کے سب گمشدہ ہیں۔ وہ راتوں رات ہوٹل سے غائب ہوتے تھے۔ ہم سمجھتے تھے کہ شاید وہ بنا کرایہ ادا کیے چلے گئے۔ لیکن۔۔۔''وہ رکا۔ اُسکا لہجہ رگوں میں سنسنی دوڑا رہا تھا۔

''لیکن؟''ہم نے پوچھا۔

''لیکن بعد میں ہمیں اطلاع ملتی کے یہاں آنے کہ بعد سے ہی وہ گمشدہ ہیں۔ اور دوبارہ کبھی نہیں ملے۔''یہ نیا انکشاف تھا۔ ہم دونوں بھونچکا رہ گئے۔

''آپ یہاں سے چلے جائیں۔ آپ اس ہوٹل کے تیرہویں مہمان ہیں۔ اور تیرہ کبھی بھی اچھا ہندسہ نہیں رہا ہے۔ آپ چلے جائیں۔۔۔ چلے جائیں۔۔۔''

''خاموش!''میں دھاڑا تو وہ چپ ہوا۔ میری آواز بادلوں کی آواز سے بھی تیز تھی، ایسا لگتا تھا جیسے ہوٹل کے در و دیوار ہل گئے ہوں۔

’’جانے دو نوید! وہ بچہ ہے۔‘‘یوسف نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے ٹھنڈا کرنا چاہا، تو میں نے اثبات میں سر ہلاتے گہری سانس لیکر خود کو پر سکون کیا۔

’’ہمیں ہمارا کمرہ دکھاؤ، اور خبردار! جو دوبارہ یہ سب بکواس کی۔‘‘میں نے لڑکے کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔ تو وہ سنجیدہ چہرے سے مجھے دیکھتے آگے بڑھ گیا۔

مجھے ایسی کسی فضولیات پر یقین نہ تھا۔

----------+---------+--------

جنوری2010

وہ میری زندگی کے بہت سارے عام سے دنوں میں سے ہی ایک اور عام سا دن تھا۔ میں اپنے دفتری کمرے کی میز کے پیچھے رکھی سربراہی کرسی سے سر ٹکائے بیٹھا تھا۔ دفتری کمرے کے باہر باقی عملہ روزمرہ کے کام کاج میں مصروف تھا۔ شیشے کے دروازے کے پار میں انویسٹیگیشن آفیسر کو دیکھ سکتا تھا، جو اس وقت کسی جوان لڑکے کے ساتھ سر کھپا رہا تھا۔ اُن دونوں سے نظریں ہٹا کر میں نے میز پر رکھی اپنی نیم پلیٹ کو دیکھا۔

ایس ایس پی نوید عالم

میرا نام جلی حرفوں میں چمک رہا تھا۔ میں نے سر کرسی کی پشت سے ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔ میں نوید عالم، ایک ایف آئی اے آفیسر ہوں۔ جاسوسی کرنا، روپ بدل کر مجرمین تک پہنچنا میرا پسندیدہ مشغلہ ہے۔ میری مصروف زندگی میں صرف کچھ دن ایسے ہوتے ہیں جو اچھے ہوتے ہیں۔ وہ میری سالانہ چھٹیوں کے دن ہوتے ہیں۔ ان دنوں میں گھومنے پھرنے جاتا ہوں، کھل کر سانس لیتا ہوں۔ اور خود کو نئے سرے سے دوبارہ کام کے لیے تیار کرتا ہوں۔ چھٹی کے یہ چند دن مجھے ہمیشہ تازگی بخشتے ہیں۔ ایسا مجھے لگتا تھا۔ پر آخری بار چھٹیوں پر بنایا جانے والا منصوبہ میری زندگی کا بھیانک ترین منصوبہ تھا۔

میں چھٹیوں پر ہمیشہ اپنے دوست کے ساتھ جاتا ہوں۔ میری اس سنجیدہ اور مصروف سی زندگی میں ایک ہی دوست تھا۔ میرا پیارا دوست یوسف!

باہر سے شور و غل کی آواز آنے لگی تو میں نے آنکھیں کھول کر شیشے کے دروازے کے اُس پار دیکھا۔ وہ کم عمر لڑکا اب آئی او پر چلا رہا تھا۔ میں نے ناگواری سے دیکھا۔ یہ روز کا معمول تھا۔ آنے والوں کو لگتا تھا کہ ہم ایک ہی دن میں انکا مسئلہ حل کرنے پر قادر ہیں۔

ہونہہ ! بے صبرے لوگ۔

میں نے پھر کرسی کی پشت سے سر ٹکا دیا۔ اُنکی مسلسل بڑھتی بحث میرے آرام میں خلل ڈال رہی تھیں۔ پر میں نظرانداز کر رہا تھا۔

اسی لمحے میرے دفتری کمرے کا دروازہ زور سے کھلا اور کوئی اندر آیا، میں نے جھٹ سے آنکھیں کھولیں اور سیدھا ہوا۔ وہی لڑکا اب اندر تھا، آئی او اور سب انسپکٹر اسے باہر نکالنے کی کوششیں کر رہے تھے۔

’’جناب ! جناب میری بات سنیں۔۔۔‘‘ وہ لڑکا مزاحمت کرنے کے ساتھ ساتھ مجھ سے مخاطب بھی تھا۔

’’نکلو باہر ! تمہاری ہمت کیسے ہوئی، یہاں آنے کی۔۔۔‘‘ عملہ اسے گھسیٹ رہا تھا۔ پر وہ بھی بھرپور مزاحمت کر رہا تھا۔ اور میں پرسکون سا یہ ساری کاروائی دیکھ رہا تھا۔ ایسے تماشے کم و بیش روز ہی ہوتے تھے۔

’’جناب ! میرے باپ کی موت حادثاتی نہیں ہے۔ اُنہیں قتل کیا گیا ہے۔‘‘ وہ چیخ رہا تھا۔

’’میری مدد کریں !‘‘ وہ التجا کر رہا تھا۔

’’چھوڑ دو اسے !‘‘ میں نے حکم دیا تو عملہ اُسے چھوڑتا پیچھے ہٹا۔

’’جناب !۔۔۔ پلیز !‘‘ وہ تیزی سے میری میز کے قریب آیا۔

’’آپ میری بات کا یقین کریں، میرے باپ کی موت حادثاتی نہیں ہے۔ انکا قتل ہوا ہے۔‘‘ اُس نے ہانپتے ہوئے کہا تو میں سنجیدگی سے اسے دیکھتا رہا، کم و بیش ہر دوسرے لواحقین کی یہی بحث ہوتی تھی کہ انکا مقتول قتل ہوا ہے۔

’’ایسا ہر شخص کو لگتا ہے۔‘‘ میں نے سکون سے کہا۔

’’پر مجھے ایسا لگ نہیں رہا۔ ایسا ہے، میرے پاس شواہد ہیں۔‘‘ وہ کرسی پر بیٹھا۔

''کیسے شواہد؟''میں نے پوچھا۔ جبکہ میں جانتا تھا کہ اسکے پاس کچھ بھی نہیں ہو گا،فقط شک کی بنا پر وہ ایسی باتیں کر رہا تھا۔ پر میں نے اسے بولنے موقع دیا۔

''مثلاً! میرے والد صاحب کے موبائل میں ایک میسیج ڈرافٹ کی صورت موجود ہے۔ وہ شاید یہ پیغام مجھے بھیجنا چاہتے تھے۔ پر بھیج نہ سکے، پیغام کے متن کے مطابق انہیں کوئی پارسل موصول ہوا تھا،اور وہ اُس پارسل سے بہت خوفزدہ تھے۔ غالباً وہ مزید پیغام لکھنا چاہتے تھے، پر آدھے ادھورے پیغام کے دوران ہی کسی نے انکو مار دیا۔''وہ روہانسا ہوا۔ یکدم ہی میری دلچسپی اس کیس میں بڑھی۔

''وہ موبائل مجھے دکھاؤ،اور اکبر! تم اسکے باپ کی کیس فائل میرے پاس لے کر آؤ!''میں نے کہا تو اکبر جی صاحب کہہ کر باہر بھاگا۔ جبکہ لڑکے نے نوکیا کا کی پیڈ موبائل فون میری جانب بڑھایا۔

میں نے فون اُسکے ہاتھوں سے لیا اور ڈرافٹ میسیج کھولا۔ لڑکا ٹھیک کہہ رہا تھا۔ جون ۲۰۰۹ کو کوئی ڈرافٹ میسیج محفوظ ہوا تھا۔ یہ اپنے آپ ہی محفوظ ہو گیا تھا۔ میں پیغام کا متن پڑھنے لگا۔

''بیٹا! مجھے لگتا ہے کہ کوئی مجھے مارنے والا ہے۔ مجھے آج ہی ایک واہیات قسم کا پارسل موصول ہوا ہے۔ اور اس پارسل میں جو سامان ہے، اسے دیکھ کر میری روح فنا ہو گئی ہے۔ بیٹا کوئی مجھے نقصان۔۔۔''اور بس، پیغام اس سے آگے نہ تھا۔

''تمہارا نام کیا ہے؟''

''حمزہ!''اس نے کہا۔

''حمزہ! کیا تمہیں یقین ہے کہ پیغام تمہارے باپ نے ہی لکھا تھا۔''میں نے بغور اسے دیکھتے پوچھا۔ اکبر میز پر فائل رکھ کر جا چکا تھا۔

''جناب! یہ موبائل میرے والد صاحب کے استعمال میں ہی تھا۔ اور یہ پیغام اسی تاریخ کو ڈرافٹ ہوا ہے، جس تاریخ کو میرے والد کا انتقال ہوا ہے۔''اُس نے کہا تو میں نے سر ہلاتے فائل دیکھی۔

مقتول کا نام: نعیم الدین

موت کا وقت: دوپہر دو بجے

موت کی تاریخ: ۵ جون ۲۰۰۹

موت کی وجہ: سیڑھیوں سے پھسلنے کی وجہ سے سر پھٹ گیا اور موت کا سبب بنا۔ جسم پر کہیں کسی تشدد یا زورزبردستی کے نشانات موجود نہیں ہیں۔

میں نے فائل کا مطالعہ کیا۔ پھر لڑکے کو دیکھا۔ اُسکی بات میں کچھ کچھ دم تو تھا۔

''تو مجھے یہ بتاؤ، وہ کونسا پارسل ہے؟'' میں نے حمزہ سے پوچھا۔

''میں نہیں جانتا، اگر میں جانتا ہوتا تو یہاں کیوں ہوتا؟ ابّا کی موت جس گھر میں ہوئی ہے، میں نے وہاں ڈھونڈنے کی بہت کوشش کی ہے۔ پر وہ گھر بہت بڑا ہے اور ابّا اس میں اکیلے رہتے تھے۔ میں تعلیم کے سلسلے میں دوسرے شہر میں تھا۔'' اُس نے کہا۔

''ٹھیک ہے حمزہ! تمہارے پاس تین دن ہے۔ اگر تم ایسا کوئی پارسل ڈھونڈنے میں کامیاب ہوتے ہوئے تو ٹھیک ہے۔ ورنہ میں خود تمہارے ابّا کے گھر آوں گا۔ پھر دیکھتے ہیں کہ کیا ہو سکتا ہے۔'' میں نے فائل پر اہم لفظ کا اسٹیمپ لگایا اور فائل اپنی سب سے محفوظ دراز میں رکھ دی۔

لڑکا مشکور نظر آنے لگا۔

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا، اُسکا باپ یقیناً قتل ہوا تھا۔

----------+---------+--------

پہلی منزل کی راہداری میں بنے کمروں میں سے ایک میں ہمیں ٹھہرایا گیا تھا۔ دو بستروں پر مشتمل یہ کمرہ خاصا کشادہ تھا۔ کمرے میں ہیٹر موجود تھا، چھت بلند اور نقش و نگار سے مزین تھیں۔ دیواروں کی تزئین اور آرائش لکڑیوں سے کی گئی تھیں۔ کمرے کی ایک جانب انسانی قد کا آئینہ کھڑا ہوا تھا۔ میں اُسکے سامنے آ کھڑا ہوا۔ محرابی کھڑکیوں سے اب آسمان پر چمکتی بجلیاں تیز ہوتی نظر آ رہی تھیں۔ کھڑکیوں سے نیچے کی جانب دیکھو تو قصبے کی روشنیاں جگنوؤں کی صورت چمکتی نذر آ رہی تھیں۔

کمرے کی پیلی روشنی میں، میں نے خود کو آئینے میں دیکھا۔ چھے فٹ دو انچ میرا قد تھا، اور بال سیاہ اور سرمئی تھے۔ آنکھ کے برابر بال برابر باریک اور انگلی جتنا لمبا کٹ تھا۔ میری سروس کے دوران پہنچنے والی چوٹوں میں سے یہ واحد تھی، جو میرے چہرے پر نشان دے گئی تھی۔ کمرے کی پیلی روشنی میں، میرا چہرہ نیم واضح سا تھا۔ یا شاید ایک وجہ یہ بھی تھی کہ آئینہ پرانا تھا، اور جگہ جگہ دھبے اور سیاہ لکیروں کی وجہ سے مجھے ٹھیک سے اپنا چہرہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

''کیا سوچ رہے ہو؟'' یوسف نے مجھے آئینے کے سامنے کھڑا پا کر پوچھا تو میں نے آئینے میں سے ہی اسے دیکھا۔ وہ اپنے بیگ پر جھکا، اپنا سامان ترتیب کے ساتھ پاس بنی الماری میں رکھ رہا تھا۔

''اس لڑکے کا کیا نام ہے؟'' میں نے نیچے موجود لڑکے کے بارے میں پوچھا۔

''اکرم نام ہے، پرانا ملازم ہے یہاں کا۔'' اُس نے کہا۔

''عجیب دقیانوسی باتیں کر رہا تھا۔'' میں نے آئینے کے سامنے سے ہٹتے ہوئے، اپنے بستر پر آ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ تو یوسف گہری سانس لیکر سیدھا ہوا۔

''وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔'' اس نے مجھے دیکھتے کہا۔

''دیکھو! انگریزوں کے دور میں اس ہوٹل پر سکھوں نے حملہ کر دیا تھا۔ مالکان اور اس وقت موجود مقیم مہمانوں کو بھی قتل کر دیا گیا تھا۔ اس واقعہ کو میں مانتا ہوں، کیونکہ اسکی تاریخ موجود ہے۔ اُسکے بعد لوگوں کا اس جگہ سے خوف کھانا فطری ردعمل ہے۔ حکومت اگر اس جگہ کو گرا کر نیا ہوٹل کھڑا کر دیتی تو ایسا نہ ہوتا۔ لیکن اُس لڑکے نے نیچے جو کہانیاں سنائی، اس پر مجھے سرے سے یقین ہی نہیں ہے۔ میں نے یہاں آنے سے پہلے کتابوں اور اخباروں میں اس جگہ پر لکھے آرٹیکل میں، یہاں کے متعلق پڑھا تھا، وہاں ایسے کوئی شواہد۔۔۔''

''وہ لڑکا ٹھیک کہہ رہا تھا۔'' یوسف نے میری بات کاٹتے ہوئے ایک مرتبہ پھر کہا تو میں رکا۔

''کیا مطلب؟'' میں نے ناسمجھی سے اُسے دیکھا۔

''ہم سے پہلے بارہ مرتبہ یہاں لوگ آ چکے ہیں۔ وہ بھی تمہاری ہی طرح ایڈونچر کے شوقین تھے۔ بھوت وجنّات پر بھروسہ نہیں کرتے تھے۔اور پھر وہ سب گمشدہ ہوگئے۔ کہاں گئے معلوم نہیں؟ تمہیں یقین نہیں تو یہاں سے جانے کے بعد ڈیپارٹمنٹ سے معلومات لے لینا۔ بارہ لوگ جو اس ہوٹل میں مختلف اوقات میں آئے،اور پھر اُنکا کچھ پتہ نہ چل سکا۔''یوسف نے تفصیل سے بتایا۔ یہ سب سننے کے بعد میں اٹھا،اور کمرے کا دروازہ بند کر کے کنڈی چڑھادی، پھر واپس یوسف کے سامنے آکر بیٹھا۔

''یوسف! اگر یہ بات سچ ہے تو،اُن بارہ لوگوں کی گمشدگی میں کسی جن بھوت کا ہاتھ نہیں ہے۔ کوئی ہوٹل میں سے ہی یہ کر رہا ہے۔''میں نے کہا۔

''کون کر سکتا ہے بھلا؟ وہ بوڑھا آدمی جو ہوٹل کا مالک ہے؟ یا وہ لڑکا اکرم؟ میں بھی ان سب باتوں پر یقین نہیں کرتا تھا لیکن نوید! میں اس قصبے میں اکثر آتا ہوں۔ اس ہوٹل میں رات کے اندھیرے میں پُراسرار سرگرمیوں کو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔''اُس نے کہا۔

''مثلاً؟''میں نے آہستگی سے پوچھا۔

''مثلاً میں نے اپنی آنکھوں سے خود ایک سائے کو ہوٹل کی چھت پر چلتے دیکھا ہے۔ جبکہ ہوٹل بند تھا۔ کھڑکیوں پر بال کھولے کھڑی کسی عورت کا سایہ بھی اکثر نظر آتا ہے۔''اُس نے بتایا۔

''مجھے اب سو فیصد یقین ہے کہ اس ہوٹل میں اور بھی کوئی چھپ کر رہ رہا ہے۔ ضروری نہیں کہ ہوٹل کے مالک کو اس بارے میں پتہ ہو، جو جگہ بہت عرصے بند رہے،اُسے اکثر مجرمین اپنا ٹھکانہ بنا لیتے ہیں۔''میرے اندر کا جاسوس یکدم ہی جاگا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی تبصرہ کرتا اُسی لمحے بجلی چلی گئی،اور پورا ہوٹل اندھیرے میں ڈوب گیا۔

''یہ کیا ہوا ہے؟''یوسف نے پوچھا۔

''غالباً بارش پھر شروع ہو چکی ہے،اور اُسکی وجہ سے بجلی چلی گئی ہے۔''میں نے تسلی دی۔ اُسی لمحے ہمارے کمرے کا دروازہ زور سے دھڑ دھڑ ہوا۔ میں نے اور یوسف نے چونک کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اُسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ اور اپنی کمر میں رکھی پستول نکالی، پھر آہستہ آہستہ دروازہ کی جانب بڑھنے لگا۔ اندھیرے کمرے بس باہر سے آتی کڑکتی بجلی کی روشنی ہی تھی۔ ورنہ تو ہاتھ کو ہاتھ سوجھائی نہ دے رہا تھا۔ دروازہ زور سے پیٹا جا رہا تھا۔ میں دروازے کے قریب ہوا، کنڈی آہستہ سے کھولی، یوسف

سانس روکے تمام کاروائی دیکھ رہا تھا۔اور اگلے ہی لمحے میں نے دروازہ کھول دیا۔دروازے پر کھڑے شخص کو دیکھ کر ہمارے اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔وہ ساٹھ پینسٹھ سالہ کبڑا بزرگ شخص تھا۔بال سفید، آنکھوں کے نیچے گہرے حلقے اور آگے کے دانت ٹوٹے ہوئے تھے۔ہاتھوں میں لینٹرن پکڑے وہ عجیب وحشت ناک نظروں سے ہمیں دیکھ رہے تھے۔

''کک۔۔۔کون ہوئے تم؟''پہلی بار میری زبان بھی لڑکھڑائی۔

''میں یہاں کا مالک ہوں۔مجھے سب نمو بابا کہتے ہیں۔''اُنکی آواز اُنکے چہرے سے زیادہ خوفناک تھی۔

''آپ تو صبح آنے والے تھے نمو بابا!''یوسف اُنہیں پہنچان گیا، تو اُٹھ کر میرے برابر آ کھڑا ہوا۔اُسکی پیدائش یہیں کی تھی۔اُسکا بچپن بھی یہیں گزرا تھا۔مجھے اپنی ان چھٹیوں پر کوئی ایڈونچر کرنا تھا۔جب یوسف نے مجھے اپنے علاقے کی اس پر اسرار ہوٹل کے بارے میں بتایا، تو میں نے اس جگہ آنے کا فیصلہ کیا۔

''ہاں! لیکن میں جلدی آگیا۔اپنے مہمانوں کے لیے۔۔۔بلکہ۔۔۔''وہ عجیب سے انداز میں کہتا رکا اور مجھے دیکھا۔لینٹرن کی روشنی اُسکے چہرے پر پڑتی، اُسے وحشت ناک سا بنا رہی تھیں۔

''تیرہویں مہمان کے لیے۔''اُسی وقت تیز ہوا چلی اور راہداری کے اختتام پر بنی کھڑکی کا پٹ زور سے کھڑکھڑایا۔

''آپ یہاں کیوں آئے ہیں؟ کوئی کام تھا ہم سے؟''میں نے لہجے میں سختی سمو کر پوچھا۔اُس شخص کی باتیں عجیب سی تھیں۔

''ابھی تو بتایا! مجھے تم سے ملنا تھا۔اپنے مہمان۔۔۔یعنی تیرہویں مہمان سے۔''اُس نے کہا، تو میں نے ضبط سے لب بھینچے، پر کہا کچھ نہیں۔

''کھانا اکرم پہنچا دے گا۔پریشان نہ ہونا۔اب تم لوگ آرام کرو، صبح ملاقات ہوتی ہے۔''وہ کہہ کر آگے جانے کے لیے مڑا، پھر کچھ یاد آنے پر پلٹا اور مجھے دیکھا۔

''یہ لینٹرن رکھ لو، رات کو کام آئیگا۔''اُس نے لینٹرن ہماری طرف بڑھایا تو یوسف نے تھام لیا۔

''شکریہ نمو بابا! پر آپ کیسے جائینگے اس اندھیرے میں۔''اُس نے پوچھا۔

''یہ میری حویلی ہے، میں آنکھ بند کر کے بھی چل سکتا ہوں یہاں۔'' وہ عجیب سے انداز میں کہتا پلٹ گیا۔ یوسف لینٹرن لیکر اندر چلا گیا، جبکہ میں راہداری میں، آہستہ آہستہ آگے بڑھتے ہوئے نمو بابا کو دیکھنے لگا۔ آگے راہداری اندھیری تھی، گھپ اندھیرے میں شیشے کی کھڑکیوں سے آتی کڑکتی بجلی کی روشنی میں مجھے وہ آگے بڑھتا نظر آیا۔ پھر ہر جانب اندھیرا چھا گیا۔ بجلی دوبارہ کڑکی تو وہ کچھ اور دور نظر آیا۔ پھر اندھیرا دوبارہ چھا گیا۔ بجلی ایک مرتبہ پھر کڑکی تو نمو بابا غائب ہو گئے۔ میں حیرت زدہ رہ گیا۔ ابھی آدھی راہداری باقی تھی، وہ اتنی تیزی سے راہداری پار نہیں کر سکتا تھا۔ راہداری کے ساتھ ساتھ ریلنگ چل رہی تھی، جس سے نیچے ہال نظر آتا تھا۔ میں تیزی سے ریلنگ تک آیا۔ جتنی بابا کی رفتار تھی، اُس حسین سے اُسے سیڑھیوں یا ہال میں ہونا چاہیے تھا۔ پر وہ کہیں نہ تھا۔ وہ اتنی جلدی کیسے غائب ہو سکتا ہے؟ پہلی بار میرا دل خوفزدہ انداز میں دھڑکا اور میں جانے کے لیے فوراً پلٹا، اور اگلے ہی لمحے وہ لینٹرن لیے میرے سامنے موجود تھا۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

''کیا ہوا؟ ڈر گئے؟'' وہ اکرم تھا، جو لینٹرن پکڑے میرے پیچھے تھا۔

''تت۔۔۔ تم۔۔۔ تم کیا کر رہے جو یہاں؟'' میں نے پھولے ہوئے تنفس کے ساتھ پوچھا۔

''کھانا لایا تھا۔'' اُس نے دوسرے ہاتھ میں پکڑی ٹرے میری نظروں کے سامنے کی۔

''دو مجھے۔۔۔'' میں نے ٹرے اُسکے ہاتھوں سے تقریباً جھپٹی تھی۔

''رات کمرے سے باہر مت نکلیے گا۔'' اُس نے کہا۔ اور آگے بڑھ گیا۔ میں سن سا وہاں کھڑا اُسے جاتا دیکھ رہا تھا۔ وہ میرے پیچھے کیسے آیا؟ میں نے اُسے آتے نہیں دیکھا۔ کیا وہ پہلے سے میرے پیچھے تھا؟ اگر تھا تو مجھے نظر کیوں نہ آیا؟ اُسکے پاس تو لینٹرن تھا۔ میں گھبرا کر کمرے کے اندر آ گیا۔

''کیا ہوا؟'' بابا کے دیے گئے لینٹرن کی روشنی میں اپنی پسندیدہ کتاب پڑھتا یوسف مجھے دیکھ کے چونکا۔

''کچھ نہیں! اکرم کھانا دے کر گیا ہے۔'' میں نے لہجے پر قابو پاتے ٹرے اُسکے سامنے رکھی، پھر دروازہ اچھے سے بند کر دیا۔ کمرے کی محرابی کھڑکیوں کے پٹ، ہوا کی وجہ سے بہت شور کر رہے تھے، میں نے انہیں بھی بند کر دیا۔ پھر یوسف کے سامنے بیٹھا۔

''مجھے تو یہ بابا جی ہی آسیب زدہ لگتے ہیں۔'' اس بات پر وہ دل کھول کر ہنسا۔

''ایسی بات نہیں ہے۔ وہ اپنی جوانی میں ایسے نہیں تھے۔ وہ تو اب ایسے ہو گئے ہیں۔''اُس نے کہا۔

''تم مانو یا نہ مانو، پر اس ہوٹل میں کچھ غلط اور غیر قانونی ہو رہا ہے۔''میں نے کہا۔

''اگر ایسا ہے تو تم تلاش کر لو، آخر کو ایک جاسوس ہو۔''اُس نے نوالہ منہ میں لیتے ہوئے کہا۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔''میرا دماغ تانا بانا بننا شروع ہو چکا تھا۔

--------+---------+----------

''تو یہ ہے تمہارے ابّا کا گھر؟''میں نے اس سنسان سی عمارت کو دیکھتے ہوئے حمزہ سے پوچھا۔

''جی! یہی ہے۔ اُنکی موت یہیں ہوئی تھی، مجھے یقین ہے کہ پارسل یہیں ہے۔''اُس نے کہا۔

''میں نے تین دن کا وقت دیا تھا، تم نے کچھ تلاش کیا؟''میں نے گھر کے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔

''نہیں! پارسل جیسی کوئی شے تو نہیں ملی، البتہ مجھے آپکو کچھ دکھانا ہے۔''وہ مجھے لیکر سیدھا تہہ خانے کی جانب بڑھا۔ تہہ خانے سے عجیب سی بو آ رہی تھی۔ میں ناک پر ہاتھ رکھتے اندر اُترا۔ اندر آتے ہی جس پہلی شے سے میرا سامنا ہوا، اسے دیکھ میرے پیروں تلے زمین نکل گئی۔

''یہ۔۔۔ یہ کیا ہے؟''میں نے حیرت کی زیادتی سے گنگ ہوتے ہوئے حمزہ سے پوچھا۔

''یہی تو میں آپکو دکھانا چاہتا تھا۔''میں نے دوبارہ فرش کو دیکھا۔ وہ کسی جوتے کے نشانات تھے، جیسے کوئی آیا ہو اور پھر واپس گیا ہو۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ وہ کسی خون آلود جوتے کے نشانات تھے۔ جیسے کوئی خون پر چڑھنے کے بعد یہاں آیا ہو۔ خون پرانا ہونے کی وجہ سے اُس جگہ سے تعفن اُٹھ رہا تھا۔ میں نے فوراً اپنا ہینڈ ٹرانسیور نکالا، اور بٹن دبایا۔

''اکبر بات کر رہا ہوں سر! اوور!''اسپیکر سے آواز ابھری۔

''اکبر! فوراً تہہ خانے میں عملے کو لیکر آؤ۔''میں نے اسے حکم دیا تو وہ کچھ ہی دیر بعد اندر موجود تھا۔

''نشانات تہہ خانے میں اترنے والی سیڑھیوں کے اختتام سے شروع ہو رہے ہیں، اور پھر اندر آنے کے بعد واپس سیڑھیوں کی جانب مڑے ضرور ہیں، لیکن وہیں ختم ہوگئے ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے کسی نے کمرے کے اندر ہی یہ خون آلود جوتا پہن کر چکر لگایا ہے۔'' اکبر نے نشانات دیکھتے ہوئے کہا۔

''جہاں تمہارے ابّا کی موت ہوئی وہ جگہ لاؤنج میں بنی سیڑھی ہے۔ اگر کوئی تمہارے ابّا کے خون پر چڑھ کر وہاں سے یہاں تک آیا تو نشانات باہر بھی ہونے چاہیے، اور تہہ خانے کی سیڑھیوں پر بھی۔'' میں نے حمزہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''اور ایسا لگتا ہے، جیسے وہ واپس بھی نہیں گیا۔'' حمزہ نے نشانات دیکھتے ہوئے کہا جو تہہ خانے میں ہی اختتام پزیر ہو رہے تھے۔

''ضروری نہیں کہ یہ خون انکے والد صاحب کا ہی ہو؟'' اکبر نے نشانات سے خون کے نمونے اٹھاتے ہوئے کہا۔

''اسکے لیے ہمیں ڈی این اے کرنا ہوگا، اور تمہارے والد کی لاش سے بھی نمونے لینے ہونگے۔'' میں نے بات مکمل کی۔

''پر اُنکو دفنائے ہوئے بھی چھے ماہ گزر چکے ہیں۔''

''ہمیں یہ مقدمہ کھولنا ہوگا، اور عدالت سے قبر کشائی کی اجازت لینی ہوگی۔'' میں نے کہا۔

''سر! جوتے کا ناپ بارہ انچ ہے۔'' اکبر نے اچانک ہی کہا۔ میں نے بیساختہ حمزہ کے پاؤں دیکھے۔ وہ قد میں چھوٹا تھا اور اُسکے پاؤں کا ناپ بھی آٹھ نو انچ سے زیادہ نہ تھا۔

''کیا گھر میں کوئی ایسا ہے جو ناپ تیرہ کے جوتے پہنتا ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں! ہم سب درمیانے قد کے لوگ ہیں۔ ہمارے یہاں کوئی بھی اتنے لمبے ناپ کے جوتے نہیں پہنتا۔'' اس نے کہا تو میں نے پریشانی سے ماتھا مسلا، یہ معاملہ کافی پیچیدہ تھا۔

''ٹھیک ہے! اس جگہ کی تلاشی لو، اور مزید نمونے اکھٹے کر کے فرانزک کے لیے بھیجو۔ جگہ کی فرانزک کے لیے بھی عملہ بلواؤ۔ ہم قبر کشائی کے بعد ہی کسی نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں۔'' میں ہدایت دیتے، احتیاط سے قدم اٹھاتا تہہ خانے سے باہر آیا ہی تھا کہ سامنے کھڑے وجود کو

دیکھ کر چونکا۔ وہ دبلا پتلا لڑکا، ہڈیوں کا ڈھانچہ لگتا تھا۔ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑا، گردن ٹیڑھی کیے، وہ مجھے عجیب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''کیا کام ہے؟'' میں نے ناگواری سے پوچھا۔ اُسکا انداز مجھے پسند نہیں آیا تھا۔ اس نے کچھ نہ کہا، بس سرد نگاہوں سے مجھے دیکھتا رہا۔

''کچھ بول کیوں نہیں رہے؟ اگر کوئی کام نہیں ہے تو راستے سے ہٹو۔'' مجھے کوفت ہوئی۔ پر وہ مجھے اسی طرح گردن ٹیڑھی کیے گھورتا رہا۔

''کامی! ہٹ جاؤ یہاں سے۔ یہ میرے مہمان ہیں۔'' اسی لمحے پیچھے سے حمزہ آیا اور اُس لڑکے کو پکڑ کر پیچھے ہٹایا۔

''آں۔۔۔۔اوں۔۔۔۔آں۔۔۔'' وہ میری طرف اشارہ کر کے عجیب سی آوازیں نکالنے لگا۔

''ہاں! پریشان نہ ہو۔ یہ ابّا کے قتل کا سراغ لگانے آئے ہیں۔'' حمزہ نے اسے کہا۔

''چلو تم اندر جاؤ!'' پھر اس نے کامی کو اندر جانے کو کہا تو وہ مجھے عجیب نظروں سے گھورتا وہاں سے چلا گیا۔

''یہ کون ہے؟'' اُسکے جانے کے بعد میں نے حمزہ سے پوچھا۔

''یہ کامی ہے، ہمارے پرانے ملازم کا بیٹا ہے، بچپن میں ہی یتیم ہو گیا تھا، ابّا نے تب سے اسے بیٹوں کی طرح پالا ہے۔''

''تو کیا اسے کوئی ذہنی مرض ہے؟''

''نہیں! یہ تو اچھا بھلا تھا۔ پڑھتا لکھتا بھی تھا، بولتا بھی تھا۔ پر جس دن ابّا کا انتقال ہوا ہے، اس دن سے یہ ایسا ہی ہے۔ نہ کچھ بولتا ہے نہ کچھ کہتا ہے۔ بس ہر شخص کو دیکھ کر ڈرتا رہتا ہے۔'' اس نے دکھ سے کہا۔

''اوہ! چلو تم پریشان نہ ہو۔ جلد ہی یہ معاملہ بھی حل ہو جائیگا۔ مجھے ابھی ڈیوٹی پر جانا ہے۔'' میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا اور باہر آگیا۔ گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے مجھے وہ ٹیڑھی گردن اور سرد آنکھوں والا لڑکا یاد آیا تو میں جھرجھری لیکر رہ گیا۔

----------+---------+--------

رات کا جانے کونسا پہر تھا؟ میری آنکھ کسی کھٹکے کی آواز سے کھلی تھی۔ میں نے اٹھنا چاہا پر ایسا لگا جیسے میرے جسم پر کوئی بھاری بوجھ آپڑا ہو۔ نہ ہاتھ ہل رہے تھے نہ پاؤں۔ میں نے بڑی مشکل سے گردن موڑ کر، برابر والے بستر پر سوئے، یوسف کو آواز دینی چاہی، لیکن حلق سے

آواز نہ نکل سکی۔ میری آنکھوں کے سامنے ہر منظر دھندلا ہو رہا تھا۔ میں پوری جان لگا رہا تھا پر ایسا محسوس ہو رہا تھا، جیسے مجھے فالج کا اٹیک آگیا ہو۔ ایسا لگتا تھا جیسے جسم سو رہا ہو پر دماغ جاگا ہوا ہو۔

اسی لمحے کمرے کا دروازہ کھلا۔ ایک سیاہ لباس میں ملبوس شخص، جس نے ہڈی پہن رکھی تھی اور چہرہ چھپایا ہوا تھا، وہ سائے کی طرح آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔

''کک۔۔۔ کون ہے؟'' میں نے چلانا چاہا۔ پر آواز گلے میں ہی کہیں گھٹ گئی۔ بجلی اب تک واپس نہیں آئی تھی۔ باہر بارش پھر شروع ہو چکی تھی یا پہلے سے جاری تھی، مجھے نہیں معلوم۔ کھڑکیوں کے پردے ہوا سے اڑ رہے تھے۔ میں نے سونے سے قبل لینٹرن کی روشنی کم کر دی تھی، اب اُسکی ہلکی سی روشنی میں وہ وجود مجھے اپنی جانب بڑھتا دکھائی دے رہا تھا۔

''یوسف۔۔۔ یوسف۔۔!'' میں نے چلانا چاہا پر یوسف ٹس سے مس نہ ہوا۔ وہ وجود میرے سامنے آر کا۔ اب جا کر میں نے دیکھا کہ اسکے ہاتھوں میں ایک خنجر تھا۔ اس سے خون کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ وہ کمرے کے کنارے، کھڑکی کے نیچے موجود چھوٹی میز تک گیا اور وہ خنجر رکھ دیا۔ آسمان پر چمکتی بجلی نے کمرے کو پل بھر کے لیے روشن کیا تو اس سائے جیسے وجود کا چہرہ واضح ہوا۔ آدھے چہرے پر ہڈ گرا ہوا تھا، صرف اُسکے مسکراتے ہونٹ ہی واضح تھے۔ بجلی گم ہوئی تو وہ بھی چلتا چلتا، یوسف کی جانب بڑھنے لگا۔

وہ کیا کرنے والا تھا؟ وہ یوسف کی طرف کیوں بڑھ رہا تھا؟ میں نے پوری قوت لگائی تاکہ اسے یوسف کی جانب بڑھنے سے روک سکوں۔ پر میری خود کی حالت اس وقت قابلِ رحم تھی۔ وہ یوسف کی قریب پہنچا اور دونوں ہاتھ اُسکے گلے پر رکھ کر گلا دبا دیا۔

''یوسف۔۔۔'' میں چلانے لگا، بے بسی کی انتہا تھی۔ میری چیخ میری حلق سے باہر نہ آرہی تھی۔ میں دیکھ سکتا تھا کہ یوسف ہاتھ پاؤں ہلکے سے ہلا رہا ہے۔ لیکن وہ بھرپور مزاحمت نہیں کر رہا تھا۔ تو کیا میری طرح وہ بھی اپنا وجود ہلانے سے قاصر تھا؟

''چھوڑ دو اسکو! خدارا!'' میں التجا کر رہا تھا، پر وہ یوسف کو چھوڑ نہیں رہا تھا۔

''یوسف۔۔۔'' میں آخری بار چلایا اور پھر میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔

--------+---------+----------

رات کا آخری پہر تھا۔ ساری دنیا تھک کر سوئی ہوئی تھی۔ ہر سو جامد سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ایسے میں، میں ناک پر رومال رکھے، ٹارچ کی روشنی میں وہ تمام کاروائی دیکھ رہا تھا۔

''اور کتنی دیر لگے گی؟'' میں نے قبر کشائی کرتے گورکنوں سے پوچھا۔

''بھائی بس تھوڑی دیر اور!'' ایک نے ماتھے پر سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔ حالانکہ رات بہت سرد تھی، ٹھنڈ رگ وپے میں سرائیت کر رہی تھی۔ لیکن اندھیرے قبرستان میں قبر کشائی کر کے مردہ نکالنا، کسی کے بھی پسینے چھڑوا سکتا تھا۔ عدالت نے آج شام ہی قبر کشائی کی اجازت دی تھی۔ ورنہ تو ایک ہفتے سے معاملہ التوا کا شکار تھا۔ جیسے ہی آرڈر آئے میں نے دیر کی نہ ہی وقت دیکھا، عملے کو لیا اور سید ھانعیم الدین کی قبر پر پہنچا۔ عملے کے آتے اور قبرستان پہنچتے تک ہی رات ہو چکی تھی۔ اب پچھلے ڈیڑھ گھنٹوں سے قبر کشائی کا عمل جاری تھا۔

''بس ہو گیا!'' گورکن چیخا تو دوسرے نے کدال پھینکا، پھر دونوں مل کر قبر میں سے لکڑی کا تختہ ہٹانے لگے۔ جیسے ہی تختہ ہٹا، ایک تعفن سا پھیلا تھا وہاں۔ ساتھ کھڑے اکبر کو تو ابکائی آگئی۔ حمزہ کی آنکھیں نم تھیں۔

''ٹھیک ہے! تم لوگ پیچھے ہٹ جاؤ!'' میں نے گورکنوں سے کہا۔

''اکبر! تم جا کر لاش کے نمونے لو۔'' اس حکم پر اکبر کی آنکھیں پھٹیں۔

''میں؟'' وہ بیچارہ پریشان ہوا۔

''ہاں! جاؤ اور جا کر نمونے لیکر آؤ فوراً!'' حکم کی تعمیل کے لیے اس نے سر جھکایا، پھر ماسک چہرے پر لگا کر اور دستانے پہن کر قبر میں اترا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ ایک چھوٹے سے تھیلے میں، جس میں دوا لگی ہوئی تھی، لاش کے کچھ نمونے ڈال کر باہر آگیا۔ اُسکی حالت غیر ہو رہی تھی، میں نے نمونے اُسکے ہاتھوں سے لے لیے۔

''ٹھیک ہے! ہم فوراً اس نمونے کا ڈی این اے کروائیں گے۔'' میں نے نمونے دوسرے عملے کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ گورکنوں نے قبر بند کرنے کا عمل دوبارہ شروع کر دیا۔

''اگر نمونے، اُن خون کے نشانات سے مل گئے تو؟'' باہر آتے ہوئے حمزہ نے مجھ سے پوچھا۔

''پھر یہ شک مزید گہرا ہو جائیگا کہ تمہارے باپ کی موت میں کسی کا ہاتھ ضرور ہے۔''میں نے جواب دیا۔

''یہ بتاؤ! کیا تم نے وہ پارسل ڈھونڈا؟''گاڑی کے پاس پہنچ کر رکتے ہوئے، میں نے اس سے پوچھا۔

''فلحال نہیں! مجھے گھر میں کسی قسم کا کوئی پارسل نہیں ملا۔ دراصل میرا گھر بہت بڑا ہے۔ وہ ہماری خاندانی حویلی ہے، میرا اکیلے پارسل ڈھونڈنا، اتنا آسان نہیں ہے۔''اس نے کہا۔

''ٹھیک ہے! میں ایک دو دنوں میں تمہاری حویلی آتا ہوں۔ ساتھ مل کر وہ پارسل تلاش کرتے ہیں۔ پارسل کا ملنا ضروری ہے، ورنہ ہم اسی طرح ہواہیں تیر چلاتے رہیں گے۔ اور قاتل کبھی نہیں مل سکے گا۔''میں نے کہا اور گاڑی کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا۔

اب مجھے رپورٹ کا انتظار تھا۔

----------+---------+---------

میں ساکت وجامد کھڑا اپنے سامنے رکھی میز کو دیکھ رہا تھا۔ صبح کی روشنی سارے کمرے میں پھیل چکی تھی، موسم آبر آلود اور سخت ٹھنڈا تھا۔ باہر ہلکی ہلکی رم جھم جاری تھی۔ لیکن ابھی ابھی پہنچنے والے صدمے نے، ایسے خوبصورت موسم کا تمام اثر زائل کر دیا تھا۔

''ایسا کیسے ہو سکتا ہے بھلا؟''یوسف نے کھوئے کھوئے لہجے میں پوچھا۔ صبح کے آٹھ بج رہے تھے، بارش کی بوندیں محرابی کھڑکی کے شیشوں پر برس رہی تھیں۔

''یہ خنجر یہاں کیسے آسکتا ہے؟ جبکہ دروازے کی کنڈی بھی اندر سے بند ہے۔''یوسف نے آگے بڑھ کر وہ خون آلود خنجر اٹھانا چاہا جو اس وقت ہماری میز پر رکھا تھا۔

''ٹھہر جاؤ! اسے ہاتھ مت لگانا۔''میں نے اسے روک دیا۔

''صبح جب میری آنکھ کھلی تو میں سمجھا میں نے شاید خواب دیکھا ہے۔ پر اب اس خنجر کی یہاں موجودگی یہ بتا رہی ہے کہ یہ خواب نہیں تھا۔ کوئی واقعی کمرے میں آیا تھا۔''میں نے خنجر کو نظروں میں رکھتے ہوئے یوسف سے کہا۔

''اور اس نے میرا گلا دبایا تھا۔''یوسف نے کہا تو میں نے چونک کر اسے دیکھا۔

''تو کیا تم نے بھی دیکھا؟''میں نے اس سے پوچھا۔

''ہاں!''

''تو تم نے کچھ کیا کیوں نہیں تھا؟ تم نے کوئی مزاحمت بھی نہ کی۔''

''کیونکہ جس طرح تم بتا رہے ہو کہ تم کچھ بھی کرنے سے قاصر تھے، بالکل اسی طرح میں بھی اپنے ہاتھ پاؤں ہلانے سے قاصر تھا۔''اس نے کہا۔

''یوسف! میری بات غور سے سنو!''میں نے اسکو کندھوں سے تھامتے ہوئے کہا۔

''کیا؟''

''کل رات اکرم ہمیں کھانا دے کر گیا تھا،اور تب سے ہماری حالت ایسی غیر ہو رہی تھی۔ آج ہم اُسکا دیا کوئی کھانا نہیں کھائیں گے۔''میں نے کہا تو اس بار یوسف بھی میری بات سے متفق نظر آنے لگا۔

''لیکن سوال یہ ہے کہ اگر کنڈی بند تھی تو وہ اندر کیسے آیا؟''یوسف نے پوچھا۔

''میں نہیں جانتا، نیند کی حالت میں مجھے لگا جیسے وہ دروازہ کھول کر اندر آیا ہے، لیکن یہ غلط بھی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اس وقت میں اپنے مکمل حواسوں میں نہیں تھا۔ ہو سکتا ہے کہ کمرے میں آنے کا کوئی اور راستہ ہو؟''میں ان ہر ممکنہ امکانات پر غور کر رہا تھا۔

''پر اکرم ایسا کیوں کر رہا ہے؟ رات ہمیں کھانا بھی اسی نے دیا تھا۔ اگر مان لیا جائے کہ اس نے ہمیں کچھ ملا کر دیا تھا، تاکہ ہم اپنے حواسوں میں نہ رہتے، تب بھی سوال یہ کہ وہ ہمیں نشہ آور شے کیوں دے گا؟ وہ ہمیں مار بھی تو سکتا ہے۔'' یوسف نے پوچھا۔

''وہ ہمیں ڈرانا چاہتا ہے۔''میں نے کہا۔

''پر وہ ہمیں کیوں ڈرائے گا؟ آخر اسے ہم سے کیا کام ہے؟''

''یہی وجہ تو معلوم کرنی ہے۔ فلحال! ہم کسی صورت اس گھر میں کچھ کھائیں گے نہ پئیں گے۔ اگر کسی کھانے پینے کی چیز کی ضرورت پڑی تو دونوں قصبے سے جا کر لے آئیں گے۔''میں نے تمام احتیاطی تدابیر کے بارے میں اسے بتانا شروع کیا۔

’’ٹھیک ہے ! اور ہاں ! میں اس گھر کے متعلق اُن بارہ لوگوں کی فائل لے کر آیا تھا جو یہاں آنے کے بعد گمشدہ ہو گئے تھے۔‘‘اس نے کہا۔

’’تم نے وہ فائل مجھے پہلے کیوں نہ دی ؟‘‘میں ناراض ہوا۔

’’تم ہی ایڈونچر کے شوقین تھے ، تو میں نے سوچا یہاں آنے کے بعد تمہیں دوں گا۔‘‘اُس نے کہا۔

’’تم وہ فائل مجھے دو، مجھے ہر حال میں اس ہوٹل کا راز معلوم کرنا ہے۔‘‘میں نے کہا، پھر ایک رومال کی مدد سے اس خنجر کو ایک تھیلے میں رکھا، اور اُسے اپنے بیگ میں محفوظ کر لیا۔ اتنی دیر میں یوسف وہ فائل نکال لایا۔

’’یہ دیکھو !‘‘اُس نے فائل میرے حوالے کی، اُسی لمحے کمرے کا دروازہ بج اٹھا۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کا چہرہ دیکھا۔

’’میں دیکھتا ہوں۔‘‘میں فائل تکیے کے نیچے رکھتے ہوئے دروازے کی جانب بڑھا، پھر آہستگی سے ایک ہاتھ سے دروازہ کھولا، دوسرا ہاتھ میرا پستول پر تھا۔

’’ناشتہ !‘‘اکرم سامنے کھڑا تھا۔ میں نے اُسکے ہاتھ سے ٹرے لی، اور دروازہ بند کرنے ہی لگا تھا کہ وہ بولا

’’رات کو نیند ٹھیک سے آئی تھی ؟‘‘اُس نے پوچھا۔

’’ہاں !‘‘میں نے عجلت میں کہا اور دروازہ اُسکے منہ پر بند کر دیا۔

’’میں رزق ضائع کرنے کے خلاف ہوں پر ہمیں مجبوراً یہ کھانا ضائع کرنا پڑے گا۔‘‘اندر آکر میں نے یوسف سے کہا۔

’’ہم اُسے واپس بھی تو کر سکتے تھے۔‘‘

’’اُسے شک ہو سکتا تھا۔‘‘میں کہتے ہوئے بستر پر بیٹھ گیا، اور بیگ میں رکھی نان خطائی نکال لی، جو سفر کے لیے ساتھ لایا تھا۔ فلحال اُسی سے کام چلانا تھا۔

اب مجھے ہر حال میں وہ فائل پڑھنی تھی۔

----------+---------+--------

رپورٹ کے مطابق تہہ خانے میں موجود خون نعیم الدین کا ہی تھا۔اب شک کی کوئی گنجائش باقی نہ تھی کہ یہ واقعی قتل تھا۔

''تو، تم مجھے یہ کہہ رہے ہو کہ چھے ماہ پہلے جب تمہارا باپ قتل ہوا، تب تمہیں یہ بات معلوم نہ ہوئی کہ تہہ خانے میں کسی کے خون آلود جوتوں کے نشانات ہیں؟''میں نے حمزہ سے پوچھا، پچھلے دو روز سے ہم اُسکی خاندانی حویلی کی تلاشی لے رہے تھے، وہ کافی بڑی تھی۔اب تک ہم پارسل تک نہیں پہنچ پائے تھے۔

''دراصل تہہ خانے میں اتنا آنا جانا نہیں ہوتا، پھر ابّا کی موت کی وجہ سے میں کافی صدمے میں تھا، لہٰذا میں نے اتنی توجہ نہیں دی۔پر جب کسی کام سے تہہ خانے جانا ہوا تو یہ نشانات دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔''اُس نے کہا۔

''اگر تو مارنے والے نے حمزہ کے باپ کو سیڑھیوں سے گرا کر مارا ہے، اور پھر وہ وہاں سے چل کر تہہ خانے آیا ہے تو باقی جگہ نشانات کیوں نہیں ہیں؟ صرف تہہ خانے کے اندر نشانات ہیں۔اور واپس جاتے ہوئے بھی کوئی نشان نہیں ہیں۔''اے ایس پی شیراز نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔شیراز بھی پچھلے ہفتے ہی اس مقدمے کے سلسلے میں میری ٹیم کا حصّہ بنا تھا۔فلحال، میری نظریں کھڑکی سے باہر نظر آتے باغیچے پر تھیں۔

''ہو سکتا ہے تہہ خانے کے اندر جانے کے بعد اُسے اندازہ ہوا ہو کہ اُسکے جوتے خون کے نشانات چھوڑ رہے ہیں۔اُس نے جوتے اُتار لیے ہوں۔''حمزہ نے امکان ظاہر کیا۔

''اس امکان کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا، لیکن سوال وہی ہے، کہ باہر نشانات کیوں نہیں ہیں؟ اتنے کم عرصے میں اُس نے نشانات کیسے صاف کر لیے؟''شیراز کہہ رہا تھا۔میری نظریں باغیچے کے اس کنارے پر تھیں جہاں کچھ عجیب سا تھا۔

''یہ کچھ عجیب سی صورتحال ہے۔آپ کیا کہتے ہیں نوید صاحب؟''حمزہ نے مجھے بھی گفتگو میں شامل کرنا چاہا۔

''وہاں کیا ہے؟''میں نے اُسکا سوال نظرانداز کرتے ہوئے، باغیچے کی جانب اشارہ کیا۔

''وہ کیاری ہے۔''اس نے میری انگلی کے تعاقب میں دیکھتے ہوئے بتایا۔

''کیا کیاری میں تازہ مٹی ڈلوائی ہے؟''

''نہیں تو!''

''تو پھر وہ جگہ اُبھری ہوئی کیوں ہو رہی ہے؟ جیسے وہاں تازہ مٹی ڈالی گئی ہو؟''میں نے سنجیدہ نظروں سے اُسے دیکھا۔ تو وہ ذرا گڑ بڑایا۔

''نہیں! ضروری نہیں ہے کہ وہ اسی وجہ سے اُبھری ہوئی ہو۔ کبھی کبھار مالی پودوں کی کانٹ چھانٹ کے دوران مٹی یہاں وہاں کر دیتا ہے۔''اس نے عجیب بھونڈی سی وضاحت دی تھی۔

''تمہارے پاس کدال ہے؟''میں نے پوچھا۔

''جی؟''اس نے نا سمجھی سے پوچھا۔

''کیا کدال ہے تمہارے پاس؟''میں نے سوال دہرایا۔

''نہیں!''اس نے فوراً کہا۔

''میں نے نیچے باغیچے میں رکھا دیکھا ہے۔''شیراز نے فوراً ٹوکا، پھر کھڑکی سے ہی باہر کی جانب اشارہ کیا۔

''وہ دیکھیں وہ رہا۔''اس نے ایک کمرے پر دیوار کے ساتھ ٹکے کدال کو دیکھتے ہوئے کہا تو حمزہ کا چہرہ سیاہ ہوا۔ میں شیراز کو اسی لیے اپنے ساتھ رکھتا تھا، وہ بہت باریک بینی سے ہر شے اور نظر رکھتا تھا۔

''چلو آؤ!''میں ہر شے نظر انداز کیے کمرے سے باہر نکلا اور باغیچے کی جانب بڑھا۔

''ایس ایس پی صاحب! آپ سمجھ نہیں رہے، وہاں کچھ بھی نہیں ہے۔''میرے ساتھ چلتے ہوئے اُس نے مجھے سمجھانا چاہا۔

''اگر کچھ نہیں ہے تو تم اتنا پریشان کیوں ہو؟''میں نے بنا رکے سنجیدہ لہجے میں پوچھا۔

''میں پریشان نہیں ہوں، آپ فضول میں وقت برباد کر رہے ہیں۔ میرے ابا کے قاتلوں کو ڈھونڈنا زیادہ ضروری ہے۔''اس نے جھنجھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔ اتنی دیر میں ہم باغیچے تک پہنچ چکے تھے۔ وہ لڑکا کامی، وہاں پہلے سے موجود تھا، ٹیڑھی گردن اور سرد آنکھوں کے ساتھ مجھے دیکھتا ہوا۔ اُسے دیکھ کر مجھے ایک بار پھر جھرجھری سی آئی۔

''چلو! اسے کھودو!''میں نے حمزہ سے کہا۔

''میں؟''اس نے سینے پر شہادت کی انگلی رکھتے تصدیق چاہی۔

''نہیں تو کیا میں؟''میں نے طنزیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''ٹھیک ہے۔''اس نے مرے مرے لہجے میں کہا اور کیاری کھودنے لگا۔فقط تین ضربیں لگانے کے بعد ہی اسے رکنا پڑا۔اندر کوئی شے ٹکرائی تھی۔

''مجھے دو!''میں نے فوری طور پر کدال اس سے لیا اور اس جگہ سے مٹی ہٹانے لگا۔تھوڑی مٹی ہٹانے کے بعد ہمیں کوئی بڑی سی شے نظر آئی۔

''میں دیکھتا ہوں۔''شیراز نے آگے بڑھ کر اُسے باہر نکالا، کیونکہ وہ دستانے پہنے ہوئے تھا۔وہ ایک گتّے کا ڈبہ تھا۔

''نعیم الدین کے نام!''ڈبّے پر لکھے نام نے ہم سب کو چونکا دیا۔

''آن۔۔۔آں۔۔۔''اسی لمحے کامی کان پر ہاتھ رکھے چلانے لگا۔

''کامی!کامی کچھ نہیں ہوا۔''حمزہ نے اسے تسلی دینا چاہی پر وہ اسی طرح کانوں پر ہاتھ رکھے، چیختا ہوا اندر بھاگ گیا۔

''یہ پریشان ہو جاتا ہے، نظرانداز کیجیے۔''حمزہ نے پاس آتے وضاحت دی۔

''تو کیا یہ تھا وہ پارسل؟''میں نے اسے دیکھا۔جسکا چہرہ اب پُرسکون لگ رہا تھا۔

''ہاں!مجھے لگتا ہے یہی پارسل ہوگا وہ، کیونکہ اس میں تاریخ بھی جون 2009 کی درج ہے۔''اس نے جذباتی انداز میں کہا، لیکن پتہ نہیں کیوں؟مجھے اُسکا انداز مصنوعی لگا۔ لیکن فلحال میں نے نظرانداز کیا۔

''اسے کھولتے ہیں۔''میں نے جیب سے دستانے نکال کر پہنے اور اسے کھولنے لگا، دیکھنے میں لگتا تھا جیسے وہ ڈبہ پہلے بھی کھولا جا چکا ہے۔ جیسے ہی میں نے وہ پارسل کھولا ہم تینوں کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔میں نے شیراز کا، اور اس نے حمزہ کا منہ دیکھا تھا۔پھر میں نے کانپتے ہاتھوں سے پارسل کے اندر موجود اس لباس کو باہر نکالا اور نظروں کے سامنے کیا۔

وہ لباس خون آلود تھا۔

--------+---------+----------

’’یعنی وہ سب کے سب لوگ اکیلے نہیں تھے، اُنکے ساتھ کوئی نہ کوئی تھا۔ ایک گمشدہ ہو جاتا اور دوسرا ہمیشہ زخمی حالت میں ملاتا، جو زخمی حالت میں ملے وہ یا تو اپنا ذہنی توازن کھو چکے ہوتے تھے، یا پھر وہ کہتے تھے کہ انکے دوست کو جنّات نے مار دیا۔‘‘ میں نے ڈھائی گھنٹہ فائل کا مطالعہ کرنے کے بعد کہا۔

’’ہاں ! ایسا ہی ہے۔‘‘ یوسف نے جواب دیا تو میں نے گہری سانس لیتے ہوئے فائل بند کر دی۔

’’تو اب؟‘‘ اس نے پوچھا۔

’’مجھے سوچنے دو۔‘‘ میں کچھ سوچتا ہوا کھڑا ہوا اور کھڑکی کے پاس آیا۔ محرابی کھڑکیوں کے شیشے پر بارش کی بوندیں ابھی تک برس رہی تھیں۔ پہاڑوں پر دھند چھائی ہوئی تھی۔ نیچے اترے بادلوں کو بغور دیکھتا میں اگلے لائحہ عمل کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ کہ اتنے میں میری نظریں نیچے پورچ تک گئیں۔ وہ کبڑا نمو بابا اپنی پرانی سی جیپ میں بیٹھ رہا تھا۔ اکرم اُسکی جیپ کے پیچھے کچھ سامان رکھ رہا تھا، غالباً وہ دور جا رہا تھا۔

’’یوسف !‘‘ میں نے جلدی سے یوسف کو پکارا تو وہ میرے پاس آیا۔

’’کیا ہوا؟‘‘

’’یہ نمو بابا کہیں جا رہے ہیں۔ پیچھے صرف اکرم رہ جائے گا۔ تم کسی طرح اکرم کو مصروف کرو، میں ہوٹل کا جائزہ لیتا ہوں۔‘‘ میرے دماغ میں منصوبہ آ چکا تھا۔

’’مگر یہ ہوٹل بہت بڑا ہے۔‘‘ اس نے کہا۔

’’تم بس اسکو مصروف کرو۔‘‘ میں تیزی سے کہتا باہر نکلا، مجھے نہیں پتہ تھا مجھے کہاں سے شروعات کرنی ہے؟ لیکن مجھے یہ ضرور معلوم تھا کہ یوسف اسے مصروف کرنے میں کامیاب ہو جائیگا۔

’’اگر تو اس ہوٹل میں کوئی غلط کام ہو رہا ہے تو مجھے ان کمروں میں تلاشی نہیں لینی۔ مجھے ایسے کمروں میں تلاش کرنا ہے جہاں چھپنا آسان ہو۔‘‘ میں نے خود سے کہا اور سیڑھیاں اتر کر ہال میں آیا۔ استقبالیہ ڈیسک پر پہنچ کر میں نے ایک نظر کھڑکی کے پار دیکھا۔ یوسف، اکرم کو لیے لان میں رکھی کرسیوں پر بیٹھا جانے کیا راز و نیاز کر رہا تھا؟ میں تیزی سے استقبالیہ ڈیسک کے پیچھے بنے ریک تک آیا اور پیچھے رکھی لاتعداد چابیوں کو دیکھنے لگا۔ سب کی سب کمروں کی چابیاں تھیں۔ میں نے کوفت سے ہر چابی کو دیکھنا شروع کیا، پر ایک چابی پر میری نظریں رک سی گئیں۔

بیسمنٹ کے الفاظ اس پر واضح تھے۔ میں نے جلدی سے وہ چابی اٹھالی۔ لیکن سوال یہ تھا کہ بیسمنٹ کا راستہ تھا کس طرف؟ میں نے ایک تفصیلی نگاہ ہال پر ڈالی تو مجھے سیڑھیوں کے برابر میں ایک چھوٹا دروازہ نظر آیا۔ میں نے جا کر اسے کھولا۔ وہ ایک راہداری تھی۔ طویل، اندھیری اور خاموش۔۔۔ میں نے جیب سے چھوٹی سی ٹارچ نکال کر جلائی اور راہداری میں آگے ہی آگے بڑھنے لگا۔ بارش کی تیز آواز، اور ابر آلود موسم کی روشنی سب کہیں غائب ہونے لگی۔ میں آگے ہی آگے بڑھ رہا تھا۔ راہداری کافی طویل تھی، جہاں راہداری کا اختتام ہوا، وہاں نیچے کی طرف سیڑھیاں جا رہی تھیں۔ میں آہستہ آہستہ سیڑھیاں اُترنے لگا۔

نیچے پہنچا تو وہ جگہ کسی گودام کے جیسی تھی، کچھ پرانے سامان، کچھ اینٹیں، گاڑھے اور پتھر وغیرہ موجود تھے۔ کچھ لکڑیاں بھی تھیں، غالباً سردیوں میں کام آتی ہونگی۔ میں ٹارچ کی مدد سے آس پاس کی تلاشی لینے لگا۔ کوئی قابل ذکر شے نہ تھی۔ اُسی لمحے مجھے سیڑھیوں پر قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میری ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ دوڑا اٹھی۔ قدموں کی آواز قریب آنے لگی، میرا ہاتھ غیر محسوس انداز میں بیلٹ میں رکھی پستول پر گیا، میں چوکنا ہو چکا تھا۔ جیسے ہی قدموں کی آواز میرے قریب سے اُبھری، میں نے فوراً پلٹ کر پستول آنے والے پر تان لی۔

’’کیا کر رہے ہو؟ میں ہوں۔‘‘ یوسف دبی دبی آواز میں چلایا تھا۔ میں نے سکھ کا سانس لیتے ہوئے اُسے گھورا، پھر پستول نیچے کر لی۔ اُسکے ہاتھوں میں لینٹرن موجود تھی۔

’’یہ کونسا طریقہ پیچھے آنے کا؟ اور۔۔۔ اور تمہیں تو میں نے اکرم کے پاس چھوڑا تھا نا؟‘‘ میں مشکوک ہوا۔

''اکرم کو میں نے باتوں میں اُلجھا کر، یہاں کا سب سے مشہور میوہ لینے قصبے کی طرف بھیج دیا ہے، اُس نے بتایا کہ نمو بابا بھی جنگل لکڑیاں کاٹنے گئے ہیں، مغرب سے پہلے واپسی نہ ہو گی۔ میں نے راہداری کا دروازہ کھلا دیکھا تو سمجھ گیا کہ تم اندر گئے ہو گے۔'' اُس نے بتایا۔ تو میں نے سکھ کا سانس لیا۔

''خیر ہے! یہاں ویسے بھی کوئی قابلِ ذکر شے نہیں ہے۔'' میں نے مایوسی سے کہا۔

''کوئی بات نہیں! یہ ہوٹل بہت بڑا ہے، اور بھی بہت سی جگہ ہیں دیکھنے کو۔'' وہ کہہ کر سیڑھی کی جانب بڑھا تاکہ واپس جا سکے۔

''ایک منٹ!'' میں نے یکدم ہی کہا تو وہ رکا۔

''کیا ہوا؟'' وہ پلٹ کر واپس آیا۔

''یہ دیوار پر موجود پانی کیسا ہے؟'' میں نے اس گیلی دیوار پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''باہر بارش ہو رہی ہے، ہو سکتا ہے سیلن ہو گئی ہو۔'' یوسف نے امکان ظاہر کیا۔

''یہ بیسمنٹ ہے یوسف! یہاں بارش کا پانی دیواروں سے کیسے آسکتا ہے؟''

''تو ہو سکتا ہے اوپر موجود کسی کمرے میں بنی پانی کی لائن اندر پھٹ چکی ہو؟''

''اِسکے پیچھے کچھ ہے، یہ دیوار لکڑی کے بھوسے سے بنائی گئی ہے۔'' میں نے دیوار میں موجود دراڑ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیا ہمیں اسے توڑنا ہو گا؟'' اُس نے پوچھا۔

''ہاں!'' میں نے ٹارچ جیب میں ڈالی کہ لینٹرن کی روشنی کافی تھی۔ یوسف نے اُسے پاس پڑی، پرانی لکڑی کی کرسی پر رکھ دیا، پھر ہم دونوں نے دیوار کو دھکّا دینا شروع کیا۔ دھکّا دینے پر ہمیں معلوم ہو گیا تھا کہ یہ دیوار اوپر سے لگائی گئی ہے۔

''یہاں بیچ میں دراڑ ہے، مجھے کوئی لمبی اور نوکیلی شے چاہیے تاکہ اسے پیچھے کی طرف کھینچ سکوں۔'' میں نے کہا تو یوسف سر ہلاتا آس پاس کچھ تلاش کرنے لگا، اتنی دیر میں، میں نے جیب سے ٹارچ دوبارہ نکال کر اُس دراڑ کے اندر جھانکا۔ کوئی قابلِ ذکر شے نظر نہ آئی۔ یوسف جانے کہاں سے ایک لوہا ڈھونڈ لیا؟ پر وہ میرے مطلب کا تھا تو میں نے اُسے دراڑ کے اندر پھنسایا، پھر ہم دونوں نے مل کر اُسے پیچھے کی

جانب کھینچا تو دیوار اپنی جگہ سے ذرا کھسکی، اور وہاں تھوڑی سی گنجائش بن گئی۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کا منہ دیکھا، پھر جلدی سے اُس گنجائش میں اپنے ہاتھ ڈال کر اُسے مزید پیچھے کی جانب کھینچا تو دیوار مکمل طور پر اپنی جگہ سے ہٹ گئی۔ ہم دونوں ہڑ بڑا کر پیچھے ہٹے، وہاں دھول مٹی کا غبار اٹھا تو ہمیں کھانسی کا دورہ پڑا۔ پھر منظر ذرا صاف ہوا تو ہم نے دیکھا کہ دیوار کے پیچھے پانچ سے چھ موٹے موٹے پائپ جا رہے تھے۔ اُن میں سے ایک سے پانی رس رہا تھا۔

''حد ہے! یہ تو پانی کی لائنیں ہیں۔ اور یہ لیک ہونے کی وجہ سے سیلن ہو رہی تھیں۔ میں نے کہا بھی تھا تم سے۔'' یوسف نے مایوسی سے کہا۔

''نہیں! یہ لیک نہیں ہے۔'' میں نے پائپ لائن کو دیکھتے پراسرار لہجے میں کہا۔

''یعنی؟''

''یعنی کہ اگر تم غور سے دیکھو، تو ان چھ کے چھ پائپ کے درمیان میں تقریباً تین تین فٹ لمبا پائپ کا ٹکڑا جوڑا گیا ہے۔ یعنی دو جانب سے پائپ کو جوڑنے کے لیے جوائنٹ لگایا گیا ہے۔''

''ہاں! ایسا تب کرتے ہیں جب پائپ چھوٹا پڑ جائے۔'' اُس نے کہا۔

''ایک پائپ چھوٹا ہو سکتا ہے، دوسرا ہو سکتا ہے۔ لیکن چھ کے چھ پائپ چھوٹے کیسے ہو گئے؟ کیا اس بات کو عقل تسلیم کر رہی ہے؟''

''یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تعمیر کے دوران تمام پائپ ایک ہی سائز کے آئے ہوں، اور بعد میں چھوٹا پڑنے پر سب میں جوائنٹ لگایا گیا ہو؟'' اُس نے کندھے اُچکاتے کہا۔

''نہیں! اِسکے پیچھے کچھ ہے۔ یہ پائپ پرانے نہیں لگ رہے ہیں۔ نہ ان پر کائی جمی ہے، نہ زنگ۔ ایسا لگتا ہے جیسے انھیں روز اپنی جگہ سے ہٹایا جاتا ہے۔''

''تمہارے دماغ میں چل کیا رہا ہے آخر؟'' اُس نے پوچھا۔

''تم نہیں سمجھو ہے، مجھے تمہیں کر کے دکھانا پڑے گا۔'' میں نے کہا پھر باری باری تمام پائپ کے والو بند کرنے لگا۔ والو بند ہونے کے بعد میں نے جوائنٹ میں لگے پائپ کھولنے شروع کیے، یوسف نے بھی میری مدد کی۔ کچھ ہی دیر میں جب تمام جوائنٹ کھل گئے، اور درمیان میں ایک پانچ فٹ لمبی، اور تین فٹ چوڑی سی جگہ بن گئی۔ میں نے اس دیوار پر ہاتھ مارا وہ لکڑی کی تھی۔ میں نے ذرا زور سے دھکّا دینا چاہا اور اگلے ہی لمحے وہ کسی دروازے کی طرح سرکنے لگی۔ میرا اور یوسف کا منہ مارے حیرت کے کھلا کا کھلا رہ گیا۔ جسے ہم دیوار سمجھ رہے تھے وہ ایک دروازہ تھا۔

''یہ کیا ہے؟'' یوسف کے منہ سے بیساختہ نکلا۔

''معلوم نہیں! ہمیں اندر جانا چاہیے۔'' میں نے گن لوڈ کر کے ہاتھ میں رکھی۔ اندر گھپ اندھیرا تھا۔ یوسف نے لینٹرن اُٹھالیا۔

اُس چھوٹی سی جگہ کو مشکل سے پار کر کے ہم اندر داخل ہوئے۔ وہ کچّے فرش سے بنا کمرے تھا، اندر تعفن اُٹھ سا اُٹھ رہا تھا۔ فرش بھی چپچپا سا ہو رہا تھا۔

''لینٹرن تیز کرو، اور آگے آؤ!'' میں نے اپنے پیچھے کھڑے یوسف سے کہا تا کہ وہ آگے آکر کمرے میں روشنی کرے۔

جیسے ہی اُس نے آگے بڑھ کر روشنی کی۔ ہم دونوں کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ چیخ کہیں حلق میں ہی رہ گئی۔

ہم اپنی زندگی کا سب سے خوفناک منظر دیکھ رہے تھے۔

--------+---------+----------

''سر! لباس پر موجود خون کا فرانزک کر لیا گیا ہے۔ یہ لباس اُن دو لوگوں کا ہے جو کچھ سال پہلے گم شدہ ہو گئے تھے۔ اُنکی گمشدگی کی رپورٹ اہل خانہ نے درج کروائی تھی۔ اور اُنکے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو سکا۔'' میں سخت چہرے اور تنے ہوئے اعصاب کے ساتھ اپنے آفس میں موجود تھا۔ حمزہ سامنے بیٹھا تھر تھر کانپ رہا تھا، جبکہ شیراز مجھے مکمل تفصیلات سے آگاہ کر رہا تھا۔

''تو یعنی وہ گمشدہ لوگ اب گمشدہ نہیں رہے۔ وہ مر چکے ہیں؟'' میں نے ایک اسٹک کی مدد سے اپنے سامنے موجود خون آلود لباس کو ذرا سا اُٹھا کر دیکھا۔

’’مار دیے گئے ہیں۔‘‘ شیراز نے تصحیح کی۔

’’ہونہہ! یہ کیس اب خطرناک صورت اختیار کر رہا ہے۔ ہمیں اب باریک سے باریک شے کا جائزہ لینا ہوگا۔ کوئی تو سراغ ہوگا جس سے معلوم ہو سکے کہ گھر میں کون آیا اور کس نے نعیم الدین کا قتل کیا؟‘‘ میں نے شیراز کو دیکھتے ہوئے کہا۔

’’کیا گھر میں کوئی سی سی ٹی وی موجود ہے؟‘‘ میں نے حمزہ سے پوچھا، تو اس سے قبل کہ وہ نفی میں سر ہلاتا شیراز بول پڑا۔

’’ہاں! ہال سے اوپر کی جانب جاتی سیڑھیوں پر ایک کیمرہ موجود ہے۔‘‘ اس بات پر جہاں میں نے شیراز کو سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا، وہیں حمزہ کا منہ حیرت سے کھلا۔

’’ہرگز نہیں! میرے گھر میں کسی قسم کا کوئی کیمرہ نہیں ہے۔‘‘ اُس نے تردید کی۔

’’ہے، میں نے اُس روز آپکے گھر پر دیکھا تھا، وہ لائٹوں کے درمیان میں اس طرح چھپا کر لگایا گیا ہے کہ کسی کو نظر نہ آئے۔ پر مجھے نظر آ گیا تھا۔ جاسوس کی نظر!‘‘ اُس نے اپنی بڑائی کرنا مناسب سمجھا۔ ویسے یہ بات سچ تھی کہ وہ اپنے اردگرد چیل کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔

’’تو تم نے مجھے اُسی روز کیوں نہ بتایا؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’ہم دیگر چیزوں پر توجہ دے رہے تھے، تو میں بھول گیا۔‘‘ اُس نے گڑبڑا کر کہا۔

’’میں آپ سے کہہ رہا ہوں کہ میرے گھر میں کسی قسم کا کوئی کیمرہ نہیں ہے۔‘‘ اس مرتبہ حمزہ کے چہرے پر غصّہ عود آیا تھا۔ میں نے اور شیراز نے حیرت سے اُسکے تاثرات دیکھیں۔

’’ہو سکتا ہے نعیم صاحب نے خود کو محفوظ نہ سمجھتے ہوئے کیمرہ لگایا ہو۔ اور آپکو اس بارے میں اطلاع نہ ہو۔ آپ تو ویسے بھی دوسرے شہر میں رہتے ہیں۔‘‘ میں نے کہا۔

’’لیکن گھر میں کہیں کوئی سسٹم نہیں ہے، تو پھر کیمرے کا کیا جواز؟‘‘ حمزہ نے کہا۔

’’ضروری نہیں ہے، آج کل ایسے کیمرے بھی آتے ہیں، جن کے اندر میموری چپ لگی ہوتی ہے، وہ چپ نکال کر کسی بھی لیپ ٹاپ میں لگائی جائے تو تمام ڈیٹا مل جاتا ہے۔‘‘ شیراز نے کہا۔

''ٹھیک ہے!''میں نے کہااور فوراًانٹر کام اٹھایا۔

''اکبر! تم ٹیم تیار کرو،اور فوراًمقتول نعیم کے گھر جاؤ، تمہیں شیراز لیڈ کرے گا۔جو بھی معاملہ ہے میں شیراز کو بتادوں گا۔''میں نے ہدایت دے کرانٹر کام واپس رکھا۔

''حمزہ! آپ انتظار گاہ میں جایئے،آپ ٹیم کے ساتھ ہی جائیں گے۔''میں نے حمزہ سے کہاتو وہ جیسے ناچاراُٹھ کر باہر گیا۔

''دروازہ بند کر کے یہاں آؤ!''میں نےاُسکے جانے کے بعد شیراز سے کہاتواس نے حکم کی تعمیل کی اور دروازہ بند کر کے میرے سامنے آیا۔

''تم نعیم الدین کے گھر اکبر کے ساتھ جاؤگے اور ہر حال میں میموری چپ لیکر آؤ گے۔مجھے حمزہ پر بالکل بھروسہ نہیں ہے، لہٰذااِسکواپنی نظروں کے سامنے رکھنا۔''میں نے آہستہ سےاُسے کہا۔

''کیاآپکواس پر شک ہے؟''اُس نے پوچھا۔

''کیا نہیں ہوناچاہیے؟''میں نے الٹاسوال کیا۔

''ہوناچاہیے،مجھے بھی اُسکی حرکتوں پراب شک ہونے لگاہے۔خصوصاًجب آپ نے کیاری کھودنے کی بات کی تب اُسکا چہرہ دیکھنے لائق تھا،اورابھی بھی وہ سی سی ٹی وی معاملے پر ضد لگارہاہے کہ اسکے گھر میں کوئی سی سی ٹی وی نہیں ہے۔''

''دومرتبہ کامی میرے سامنے آیااور چیخنے چلانے لگا۔اوردونوں مرتبہ حمزہ نے اسے یہ کہہ کر مجھ سے دور کردیا کہ اسکاذہنی توازن درست نہیں ہے۔''میں نے بتایا۔

''توکیاوہ کچھ چھپارہاہے؟''اُس نے پوچھا۔

''مجھے لگتاہے کہ۔۔۔''میں رکااور آواز کومزید آہستہ کیا۔''نعیم کے قتل میں اسی کاہاتھ ہے۔'' اس بات پر شیراز نے مجھے اچھنبے سے دیکھا۔

''لیکن وہ اپنے باپ کو قتل کیوں کرے گا؟''

’’جائیداد کے لیے لوگ کسی بھی حد تک جا سکتے ہیں۔اور اُسکے باپ کی تو ویسے بھی کروڑوں کی حویلی ہے۔‘‘میں نے کہا۔

’’ٹھیک ہے!مان لیتے ہیں کہ اس میں حمزہ کا ہاتھ ہے۔تو کیا ضرورت تھی اُسے کہ وہ آ کر پولیس میں شکایت درج کرواتا جبکہ یہ مقدمہ تو پہلے ہی حادثہ کہہ کر بند کر دیا گیا تھا۔‘‘شیراز نے پوچھا۔

’’ایسا مجرم تب کرتے ہیں،جب وہ اپنے اوپر سے شک ہٹانا چاہتے ہیں۔اس طرح وہ ہر وقت پولیس کی نظروں کے سامنے مخلص رہتے ہیں اور اُن پر کسی کا شک نہیں جاتا۔‘‘

’’لیکن اس مقدمے میں ایک مسئلہ ہے،جب پولیس اس مقدمے کو حادثہ کہہ کر بند کر چکی تھی۔تو حمزہ کو یہ کیس کھلوانے کی کیا ضرورت تھی؟جبکہ کسی کو شک بھی نہیں تھا کہ یہ قتل ہے؟‘‘شیراز نے پوچھا۔

’’ہو سکتا ہے کہ اس نے کسی کے ذریعے اپنے باپ کا قتل کروایا ہو۔اور اب وہ قاتل اسکو دھمکی دے رہا ہو،یا مزید پیسوں کا مطالبہ کر رہا ہو۔اس صورت میں وہ پہلے ہی خود کو مظلوم ثابت کرنے کے لیے مقدمہ کھلوا چکا ہو؟‘‘میں نے تمام ممکنہ امکانات پر غور کیا۔

’’اب مجھے آپکی باتیں درست معلوم ہو رہی ہیں۔بہر حال!میں جا کر سی سی ٹی وی کی میموری چپ لیکر آتا ہوں۔پھر دیکھتے ہیں کہ کیا معلوم ہوتا ہے؟‘‘اس نے کہا اور مجھ سے اجازت لے کر جانے کے لیے مڑا۔

’’اور سنو!‘‘میں نے پیچھے سے آواز دی تو وہ رکا اور پلٹا۔

’’اس لڑکے کامی سے بھی کچھ معلوم کرنے کی کوشش ضرور کرنا۔مجھے لگتا ہے کہ وہ ضرور کچھ جانتا ہے۔حمزہ نے اسے ڈرا کر رکھا ہوا ہے شاید!‘‘مجھے مکمل یقین ہو گیا تھا کہ حمزہ ہی ان سب چیزوں کے پیچھے ہے۔

’’ٹھیک ہے!‘‘اس نے کہا اور چلا گیا۔اُسکے جانے کے بعد میں نے اپنا سسٹم کھول لیا۔اب مجھے ہر صورت یہ معلوم کرنا تھا کہ جون 2009 کی تاریخوں میں حمزہ کہاں تھا؟

----------+---------+--------

جو ہم دیکھ رہے تھے،وہ ہماری زندگی کا سب سے خوفناک منظر تھا۔

''یوسف۔۔۔یوسف نکلو یہاں سے۔۔۔جلدی کرو!''میں بری طرح چیخا تھا۔یوسف اور میں اُلٹے قدموں باہر بھاگے۔

''ہمیں دروازہ بند کر دینا چاہیے۔'' باہر آکر اُس نے پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان کہا تھا۔

''ہمارے پاس وقت نہیں ہے یوسف! یہ جس نے بھی کیا ہے اسے معلوم ہو چکا ہو گا اب تک، کہ ہم اسے راز سے واقف ہو چکے ہیں۔ کیونکہ ہم نے پانی کی تمام لائنیں بند کر دی ہیں۔نلکوں میں پانی نہیں آئے گا تو وہ یہیں آئیں گے۔ہمیں اب صرف اپنی جان بچانی ہے۔'' میں نے کہا۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔''ہم دونوں اتنے بدحواس تھے کہ ہم نے ہوٹل سے اپنا سامان بھی نہ لیا اور باہر آ گئے۔ باہر آئے تو آسمان دیکھ کر ہمارے چھکے چھوٹ گئے، گھٹائیں غضبناک حد تک سیاہ تھیں، بجلی ایسے چمک رہی تھی کہ دل دہل جائے، لگتا تھا طوفان آنے والا ہے۔

''اب کیا کریں؟''یوسف نے پریشانی سے پوچھا تھا۔

''مجھے نہیں معلوم، ہمیں ہر حال میں یہاں سے نکلنا ہے۔''میں چلایا۔

''پر ہمارے پاس کوئی گاڑی نہیں ہے نوید! ہم ایسے طوفان میں قصبے تک نہیں جا سکتے۔''وہ مجھ سے زیادہ زور سے چلایا۔ہم دونوں کے اوسان خطا ہو رہے تھے، شاید ہمارے حواس ہمارا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔بادل کی گرج الگ دل دہلا رہی تھی۔

''یہاں مرنے سے اچھا ہے کہ ہم طوفان میں مر جائیں۔''میں نے کہا۔

''تم تو اُن مجرمین کو پکڑنا نہیں چاہتے تھے؟''یوسف نے طنزیہ لہجے میں کہا تو میں نے رک کر اسے دیکھا۔پھر گہری سانس بھر کے اسے کندھوں سے تھاما۔

''یوسف! تم میرے دوست ہو، بھائی ہو۔مجھے اپنی فکر نہیں ہے، پر میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔تمہاری ماں تمہارا انتظار کر رہی ہے، تمہارے بچے تمہاری واپسی کے منتظر ہیں۔میری بات کو سمجھو! جو ہم ابھی ابھی اندر دیکھ کر آئیں ہے، اُسکے بعد میں اور تم اکیلے سب حل نہیں کر سکتے، ہمیں پوری ٹیم چاہیے ہو گی۔اور سب سے بڑھ کر یہ خوش نصیبی ہے ہماری، کہ ہم یہاں سے زندہ نکل رہے ہیں۔''میں نے اسے سمجھایا۔

''معاف کرنا! میں غصّے میں تھا۔ دماغ بالکل کام نہیں کر رہا اس وقت۔''اس نے معذرت خوانہ لہجے میں کہا۔

''کوئی بات نہیں! تم دوست ہو میرے۔''میں مسکرایا۔

''ٹھیک ہے پھر، ہم کچھ نیچے چلتے ہیں۔ کیا معلوم کوئی لفٹ مل جائے؟ قصبے تک پہنچ جائے تو آسانی ہو جائیگی، میرے چچا کا گھر وہیں ہے، ہم وہاں قیام کر سکتے ہیں۔'' وہ کہتے ہوئے آگے بڑھا تو میں اس کے پیچھے چل دیا۔

نمو بابا نہیں آئے تھے، اکرم بھی یقیناً نہیں پہنچا تھا، موسم دیکھ کر وہ قصبے میں ہی رک گیا ہو گا۔ ہم یہاں سے آرام سے نکل سکتے تھے۔

لیکن شاید یہ ہماری بھول تھی۔

ہم چند کلو میٹر بھی نہ چلے تھے، کیونکہ ہوا اتنی تیز چلنے لگی تھی جیسے درختوں کو اکھاڑ پھینکے گی، پہاڑوں پر ویسے ہی پھسلن ہو رہی تھی، اوپر سے بارش بھی موسلا دھار شروع ہو چکی تھی۔ اندھیرا اتنا کہ دن کو رات کا سماں لگنے لگا تھا، اور حد نگاہ صفر رہ گئی۔

''ہم اس طرح قصبے تک نہیں جا سکتے، بارش بہت خوفناک ہو رہی ہے۔''یوسف نے رکتے ہوئے کہا۔ ہم دونوں مکمل بھیگ چکے تھے۔ اوپر سے سردی سے جسم کپکپا رہا تھا۔

''ہمیں کچھ نہ کچھ کرنا ہو گا۔ اس طرح بارش میں بھی نہیں کھڑے رہ سکتے۔''بادل دھماکے کی صورت گرجا۔ اور اسی لمحے وہاں کسی گاڑی کی روشنی نظر آنے لگی۔

''گاڑی آ رہی ہے۔''میں نے ہاتھ آگے بڑھا کر لفٹ کا اشارہ کیا۔ شاید اندر بیٹھے شخص نے ہمارا اشارہ دیکھ لیا۔ اس نے ہمارے قریب جیپ روکی اور شیشہ نیچے کیا۔ اسے دیکھتے ہی ہمارے رہے سہے اوسان بھی خطا ہو گئے۔ وہ نمو بابا تھے۔

''تت۔۔۔۔تم؟''میرے منہ سے نکلا۔

''ارے! آپ دونوں کہاں جا رہے ہو؟''اُس نے ہمیں دیکھ کر پوچھا۔ میں نے یوسف کا اور اس نے میرا منہ دیکھا۔ اسی لمحے ہوا سے جھولتا ایک درخت جڑ سے اُکھڑ کر کھائی میں جا گرا۔ ہم دونوں گھبرا کر پیچھے ہٹے۔

''طوفان مزید بڑھنے والا ہے، اس لیے میں واپس آگیا۔ شدید موسمی صورتحال میں نقصان کا خطرہ رہتا ہے۔'' نمو بابا نے ہمیں خوفزدہ دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

''تم لوگ کہاں جا رہے ہو؟'' ہمیں خاموش دیکھ کر اس نے سوال دہرایا۔ بارش تڑتڑ برس رہی تھی۔

''ہم۔۔۔ قصبے تک جا رہے رہے، میرے چچا سے ملنے۔'' یوسف نے سنبھل کر کہا۔

''میں تمہیں قصبے تک چھوڑ دیتا لیکن آگے لینڈ سلائیڈنگ ہو چکی ہے۔ راستہ بند ہو چکا ہے۔'' اس بات پر یوسف نے مجھے دیکھا۔

''لیکن ہمارا جانا ضروری ہے۔'' اُس نے کہا۔ وہ اُنہیں شک نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔

''تمہاری مرضی ہے، لیکن آگے دو جگہ لینڈ سلائیڈنگ ہو چکی ہے۔ اس طرح راستے میں کھڑے رہنا نقصان دہ ہے۔'' اُس نے کہا تو میں یوسف کے قریب ہوا۔

''ہمیں اسکے ساتھ چلنا چاہیے، میرے پاس ہتھیار موجود ہیں۔ کم از کم آج کی رات ہمیں وہیں گزارنی ہو گی۔'' میں نے سرگوشی نما آواز میں کہا تو اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ہمارے پاس اور کوئی چارہ نہ تھا۔

''ٹھیک ہے! ہم واپس چلتے ہیں۔'' اُس نے قدرے مایوسی سے کہا۔

''آجاؤ! آجاؤ!'' نمو بابا نے خوش ہو کر دروازہ کھول دیا۔ یوسف پیچھے بیٹھا جبکہ میں آگے۔ نمو بابا نے جیپ چلادی، بارش خطرناک حد تک تیز تھی۔ میں نے اپنی نشست پر سر گرا لیا۔ پیچھے یوسف بھی سر ہاتھوں میں تھامے بیٹھا تھا۔

ہمارے لیے آج کا واقعہ اعصاب شکن تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں تاکہ کچھ دیر خود کو پرسکون کر سکوں۔

آنکھیں بند کرتے ہی مجھے پھر سے بیسمنٹ میں بنا وہ کمرہ یاد آیا۔ چاروں جانب مردے کھڑے تھے، ایسے جو ہڈی بن چکے تھے، اور ایسے بھی جو ابھی مکمل ہڈی نہیں بنے تھے۔ اُنکے جسموں پر لباس موجود تھا، اور گوشت کیڑے کھا رہے تھے۔ وہ تعداد میں بارہ تھے۔ اُنکے لباس دیکھ کر لگتا تھا، اُنہیں جس حالت میں قتل کیا گیا، اسی حالت میں یہاں لا کر کھڑا کر دیا گیا۔

میں نے گھبرا کے آنکھیں کھول دیں، وہ منظر ذہن سے سالوں نہیں نکلنے والا تھا۔ پر اب اسی گھر میں واپس جانا ہماری مجبوری تھی۔

اور شاید۔۔۔

سب سے بڑی غلط بھی۔۔۔

----------+---------+--------

خاموش کمرے میں اس وقت فقط پانچ نفوس موجود تھے۔ میں شیراز، اکبر، حمزہ اور کامی۔

سی سی ٹی وی سے ملنے والی میموری چپ کو عملے نے ایک کارڈ ریڈر میں ڈال کر اُس میں موجود تمام ویڈیو نکال لی تھیں۔ اکبر نے جون اور اسے سے گزشتہ مہینوں کی تمام ریکارڈنگ دیکھنے کے بعد ہمیں ضروری ریکارڈنگ دکھانے کے لیے بلایا تھا۔

''چلاؤ!'' میں نے حکم دیا۔

ویڈیو چلنے لگی۔

تین جون 2009

نعیم الدین گھر کا جھاڑو دے رہے ہوتے ہیں، کامی پاس ہی بیٹھا ہوا تھا۔ بظاہر سب کچھ نارمل تھا۔ لیکن

''وہاں کھڑکی کے پاس کوئی ہے؟'' حمزہ یکدم ہی چیخا۔

''ہمیں نظر آرہا ہے حمزہ!'' میں نے سنجیدگی سے اسے جواب دیا۔ ریکارڈنگ میں موجود ہال کی کھڑکی کے پاس کوئی وجود کھڑا نظر آیا تھا۔ سائے جیسا۔ اسی لمحے نعیم الدین نے پلٹ کر دیکھا اور وہ وجود پیچھے ہٹ گیا۔ ریکارڈنگ ختم ہو گئی۔

''دوسری ریکارڈنگ چلاؤ!'' میں نے کہا۔

چار جون 2009

کوئی سایہ جیسا، سیاہ لباس پہنے لمبا چوڑا وجود گھر کے ہال میں چکر کاٹ رہا تھا، اُسکا چہرہ غیر واضح تھا۔

پانچ جون 2009

نعیم الدین ایک بار پھر سیڑھیوں کا جھاڑو دے رہے تھے، کہ بیل بج اٹھتی ہے، وہ تیزی سے باہر جاتے ہیں۔ اُنکے جاتے ہی وہی سیاہ لباس پہنا وجود سیڑھیوں کے قریب آتا ہے، چائے کی پیالیاں میز سے اٹھاتا کامی اس بات سے انجان ہوتا ہے۔ وہ وجود قریب آتا ہے، اور کامی کی گردن پر کوئی سرنج گھونپ دیتا ہے۔ اُس سرنج کے لگنے کے بعد کامی کا وجود زمین پر گرجاتا ہے اور جھٹکے کھانے لگتا ہے۔ وہ سیاہ لباس پہنا شخص، کامی کو گھسیٹتے ہوئے دوسرے کمرے میں لے جاتا ہے۔ اتنے میں نعیم الدین اندر آتے ہیں۔ اُنکے ہاتھ میں ایک پارسل ہوتا ہے۔ وہ پارسل لے کر کسی دوسرے کمرے میں چلے جاتے ہیں۔ وہ سیاہ لباس والا وجود واپس باہر آتا ہے۔ پھر اپنے ہاتھوں میں موجود کوئی تیل نما گاڑھا مادہ سیڑھیوں پر گراتے ہوئے اوپر بڑھنے لگتا ہے۔ اسی لمحے نعیم الدین باہر آتے ہیں، وہ وجود اُنکو دیکھ کر اوپر کی طرف بھاگتا ہے، وہ اُسکے پیچھے دوڑتے ہیں اور اسی لمحے سیڑھیوں سے پھسل کر گر جاتے ہیں۔ پھر وہ وجود واپس آتا ہے۔ نعیم الدین کے خون پر سے چڑھتے ہوئے تہہ خانے تک جاتا ہے، واپس آتا ہے تو اسکے پیروں میں جوتے نہیں ہوتے، بلکہ ہاتھوں میں صفائی ستھرائی کا سامان ہوتا ہے۔ وہ بڑے سکون سے خون آلود جوتے کے نشانات صاف کرتا ہے، سیڑھیوں پر لگا وہ مادہ جسکی وجہ سے نعیم الدین پھسل کر گرے تھے، وہ بھی صاف کرتا ہے۔ صرف انکا خون رہنے دیتا ہے۔ پھر اپنا کام پورا ہونے کے بعد جوتے ہاتھ میں لیکر باہر نکل جاتا ہے۔

اس تمام ریکارڈنگ کے دوران کامی چیخنے چلانے لگا تھا۔ ہم نے اسے چیخنے دیا۔

''دیکھا! دیکھا! میں نے کہا تھا کہ میرے باپ کو کسی نے مارا ہے۔'' حمزہ جذباتی ہوتے ہوئے اُٹھ کے میرے پاس آیا۔

''ہاں! اور خوشی کی بات یہ ہے کہ ہم نے قاتل ڈھونڈ لیا ہے۔'' میں نے اُسکے کندھے پر ہاتھ رکھتے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کیا واقعی؟ کون ہے وہ؟'' اُس نے متجسس انداز میں پوچھا۔ اور اگلے ہی لمحے میں نے اُسکا ہاتھ پیٹھ پر لے جاکر موڑا اور بندوق اُسکے سر پر تان لی۔

''تم۔۔۔ تم ہو قاتل!'' میں نے سخت لہجے میں کہا۔

''کیا بکواس کر رہے ہو تم؟ میں اپنے باپ کا قتل کیوں کروں گا؟'' وہ چلایا۔

''یہ تو تم بتاؤ گے۔'' شیراز نے اسے دیکھ کر کہا۔ کامی کانوں پر ہاتھ رکھے چیخے جا رہا تھے۔

''میں نے ایسا کچھ نہیں کیا ایس ایس پی صاحب! آپ بکواس کر رہے ہیں۔'' وہ مزاحمت کرنے لگا۔

’’تم پانچ جون کی صبح اسی شہر میں تھے۔‘‘اکبر نے کہنا شروع کیا۔

’’یہ جھوٹ ہے، میں وہاں نہیں تھا۔‘‘اُس نے کہا۔تو میں نے اُسکا ہاتھ اور زور سے موڑا۔

’’میں وہاں نہیں تھا۔‘‘اُس نے زور دیا۔

’’تم نے پانچ جون کو ہی اُس شہر جانے کے لیے بس کی ٹکٹ بک کروائی تھی۔‘‘

’’میں نے کروائی تھی، پر میں نہیں جا سکا تھا۔‘‘

’’تو تم قبول کر رہے ہو۔‘‘

’’میں نے کچھ قبول نہیں کیا ہے۔‘‘اگلے ہی لمحے اکبر نے زوردار تھپڑ اُسکے منہ پر جڑ دیا۔

’’کامی! تم نے قاتل کو دیکھا تھا؟‘‘میں نے سامنے بیٹھے کامی کو مخاطب کیا۔

’’آن۔۔۔آں!‘‘وہ زور زور سے سر ہلانے لگا۔

’’تو اشارہ کر کے بتاؤ کہ کون ہے اصل قاتل؟‘‘

’’ہاں کامی! بتاؤ انہیں کہ وہ کون ہے؟‘‘حمزہ نے بھی کہا۔

’’یہ۔۔۔ت۔۔۔یہ۔۔۔‘‘وہ زور زور سے اُچھلتے ہوئے حمزہ کی جانب اشارہ کرنے لگا۔اب تو شک کی گنجائش ہی نہ رہی تھی۔

’’گرفتار کر لو اسے۔۔۔‘‘میں نے کہا تو اکبر اور شیراز نے آگے بڑھ کر اسے تھام لیا۔

’’یہ سب جھوٹ ہے، غلط فہمی ہے یہ۔‘‘وہ چلا رہا تھا۔پر وہ اسے گرفتار کر چکے تھے۔

----------+---------+--------

ہم ہوٹل کے سامنے اُتر گئے۔اکرم بھاگ کر ہمارے لیے چھاتا لے آیا۔

’’کیا تم اندر ہی تھے؟‘‘ہم نے اچھنبے سے اسے دیکھا۔

''جب آپ لوگ ہوٹل سے جارہے تھے اسی وقت آیا تھا، آپ لوگوں کو آوازیں بھی دیں لیکن شاید گرج چمک کے وجہ سے آپ تک آواز نہیں پہنچی۔''اس نے کہا۔ میں لب بھینچے اندر کی طرف بڑھ گیا۔ آتش دان میں لکڑیاں جل رہی تھیں، باہر کی نسبت اندر کا موسم گرم تھا۔ کچھ لمحوں کو سکون آیا، پر خوف کہیں نہ کہیں موجود تھا۔

''تم لوگ اپنے کمرے میں جاکر کپڑے بدل لو۔ قصبے کل چلے جانا، جب تک اکرم کھانا لے آئے گا۔''نمو بابا نے کہا۔

''ٹھیک ہے!''میں نے کہا پھر یوسف کا ہاتھ تھاما اور تیزی سے اوپر آیا۔ اپنے کمرے میں آکر سختی سے دروازہ بند کر کے چٹخنی چڑھا دی۔

''ہمیں آج رات کسی طرح نکالنی ہے۔ ہر صورت۔۔۔ ہمیں کچھ بھی نہیں کھانا پینا۔''میں نے یوسف کو کہا۔

''ٹھیک ہے۔۔۔''اُس نے سر ہلایا، اُسکی حالت غیر ہو رہی تھی۔

''تمہیں کیا ہوا ہے؟ کیا تم ٹھیک ہو؟''میں نے اُس سے پوچھا۔

''پتہ نہیں؟''وہ کانپ رہا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اسکے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ وہ گرم ہو رہا تھا۔

''لگتا ہے تمہیں ٹھنڈ لگ گئی ہے، بخار تیز ہو رہا ہے۔''میں نے اس سے کہا۔ اُسکا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

''مم۔۔ میں ٹھیک ہوں۔ پریشان نہ ہو۔''اُس نے کہا، اب کہ اسکی آواز بھی بھاری ہونے لگی تھی۔

''تم فوراً کپڑے تبدیل کرو۔''میں نے کہا اور اپنا سامان جو ہم یہاں چھوڑ کر چلے گئے تھے، اس میں سے تولیہ ڈھونڈنے لگا۔ اسی لمحے میرے ذہن میں جھماکا ہوا۔ میں نے وہ خون آلود خنجر یہیں رکھا تھا۔ اسی بیگ میں۔۔۔ وہ اب موجود نہیں تھا۔ میں نے بیگ الٹ پلٹ کر دیکھا پر وہاں کچھ نہ تھا۔

''کیا کچھ ہوا ہے کیا؟''یوسف نے پوچھا۔

''نہیں کچھ نہیں! میں بس کچھ سامان تلاش رہا تھا۔ تم یہ لو تولیہ!''میں نے بات گول کی، میں اسے پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ اسے لیکر باتھروم کی جانب بڑھ گیا۔ میں تھک کر وہیں بیٹھ گیا۔

کچھ دیر بعد ہم دونوں لباس تبدیل کر کے خاموشی سے کمرے میں بیٹھے تھے، بارش زور و شور سے جاری تھی۔ کمرے کا دروازہ ہم نے اب تک نہیں کھولا تھا۔ اکرم بھی کھانا لیکر نہیں آیا تھا۔۔ باتھ روم میں پانی آرہا تھا، شاید کسی نے لائن کھول دی تھی۔ اور خدا جانے اب کیا ہونے والا تھا؟ یوسف کی طبیعت بگڑتی جا رہی تھی۔

''تمہیں کچھ کھانا ہوگا۔'' میں نے اسے دیکھ کر کہا۔

''نہیں! میں یہاں کچھ بھی نہیں کھاؤں گا۔'' اُس نے کہا۔

''ٹھیک ہے! تمہارے لیے میں سوپ تیار کرتا ہوں۔ تم بس ہمت کر کے میرے ساتھ نیچے چلو۔ تاکہ میری نظروں کے سامنے رہو۔'' میں نے اسے سہارا دے کر اٹھایا۔ وہ نقاہت زدہ سی حالت میں میرے سہارے چلتا نیچے آیا۔ میں نے اسے ہال میں رکھے صوفے پر بٹھایا۔ سامنے باورچی خانہ تھا۔

''تم یہاں کیا کر رہے ہو بیٹا؟ ہم تمھارے لیے کھانا لا رہے تھے۔'' نمو بابا نے کہا۔

''نہیں! یوسف کی طبیعت خراب ہے، وہ صرف میرے ہاتھ کا بنا سوپ پیتا ہے۔ آپ مجھے باورچی خانے میں جانے کی اجازت دیجئے۔'' میں نے جھوٹ کہا۔

''سامنے ہی ہے، تم چلے جاؤ۔'' انہوں نے کہا اور اکرم کی میرے ساتھ بھیج دیا تاکہ وہ مجھے سامان بتادے۔ وہ میرے ساتھ باورچی خانے آ گیا۔

''آپکو یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔'' باورچی خانے میں آکر ایک بار پھر اکرم نے اسی لہجے میں کہا۔

''کیا تم خاموش رہوگے؟'' مجھے چڑ ہوئی۔ پھر میں نے ایک پتیلا نکالا، اور فریج سے سبزیاں نکال کر کاٹنے لگا۔ گاہے بگاہے میں یوسف پر بھی نظر ڈال لیتا، جو صوفے پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ نمو بابا سامنے ہی بیٹھے تھے۔

''تم بار بار ایسا کیوں کہتے ہو؟'' اب کہ میں نے اکرم سے پوچھنا چاہا۔

''وہ یہیں رہتے ہیں۔۔۔ وہ انسانوں کی قربانی مانگتے ہیں۔ وہ خون مانگتے ہیں۔'' وہ عجیب خوفزدہ لہجے میں کہنے لگا۔

''کون ہے وہ؟''میں نے پوچھا۔

''وہ۔۔۔وہ بعل ہیں۔۔۔وہ جن ہیں۔۔۔''اسی لمحے بجلی چلی گئی اور سارا ہوٹل اندھیرے میں ڈوب گیا۔میں نے جلدی سے جیب میں ہاتھ ڈالا، پر میں اپنی چھوٹی ٹارچ وہیں کمرے میں بھول آیا تھا۔

''یوسف!کیا تم یہیں ہو؟کوئی روشنی کرو جلدی!''مجھے اپنی نہیں یوسف کی فکر تھی۔اُس نے جواب نہ دیا۔

''یوسف!تم یہیں ہو نا؟''میں پھر چیخا۔اس بار بھی جواب نہ آیا۔ میرے دل کو انہونی کا احساس ہوا۔تو میں اندھیرے میں گرتے پڑتے، ایک اندازے سے یوسف تک پہنچا۔اُسی لمحے لینٹرن روشن ہو گیا۔

''یوسف!''میں نے صوفے پر ڈھے ہوئے یوسف کو دیکھا اور فوراً پنجوں کے بل اُسکے سامنے بیٹھا۔

''یوسف!تم ٹھیک ہو؟یوسف!جواب دو۔۔۔تم کچھ بول کیوں نہیں رہے؟یوسف!''میں اُسے جھنجھوڑ رہا تھا۔لیکن جیسے اُسکے جسم میں جان نہ رہی تھی۔

''یوسف!''میں چیخا۔''کیا ہوا ہے اسے؟بتاؤ مجھے!''میں پاس کھڑے اکرم اور نمو پر چیخنے لگا۔جو مجھے عجیب نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

''وہ اسے لے گئے۔وہ لے گئے۔۔۔بعل لے گئے اُسے۔۔۔''وہ دونوں بڑبڑانے لگے۔

''کیا بکواس کر رہے ہو؟کون لے گئے؟''مجھے اپنی آواز لڑکھڑاتی ہوئی محسوس ہوئی۔باہر بجلی زوردار انداز میں کڑکی تھی۔

''یوسف!یوسف تم ٹھیک ہو نا؟مجھے جواب دو۔''میں نے ایک بار پھر اُسے جھنجھوڑا تو وہ اپنے پورے وجود کے ساتھ ایک جانب ڈھلک گیا۔میں ساکت سا جہاں تھا وہیں بیٹھا رہ گیا۔

''وہ لیے گئے۔۔۔وہ تیرھویں مہمان کو لے گئے۔۔۔وہ لے گئے۔۔۔''میرے پیچھے وہ دونوں بولتے چلے جا رہے تھے۔میں نے کانپتے ہاتھوں سے یوسف کے گلے پر ہاتھ رکھ کر نبض دیکھی۔۔۔ایک منٹ۔۔۔دو منٹ۔۔۔اور نبض نہیں چلی۔

''نہیں۔۔۔نہیں۔۔''میں نفی میں سر ہلانے لگا۔

''یہ نہیں ہو سکتا۔یوسف۔۔۔یوسف۔۔۔''میں حلق کے بل چیخا تھا۔میری چیخوں نے ہوٹل کے در اور دیوار ہلا دیے تھے۔

''یوسف۔۔۔یوسف۔۔۔میرے بھائی۔۔۔یوسف!''میں چیختا جارہا تھا،اور روتا جارہا تھا۔

''وہ لے گئے۔۔۔وہ تیرہواں مہمان لے گئے۔۔۔''

''یوسف!اُٹھ جاؤ۔۔۔تم نہیں مرسکتے۔تمھاری ماں انتظار کررہی ہے یوسف!''میں بلک بلک کر رورھا تھا۔میرا دوست،میرا بھائی یوسف،اس اندھیری رات میں خاموشی سے مرچکا تھا۔

''وہ لے گئے۔۔۔''اگلے ہی لمحے میں کھڑا ہوا اور زوردار گھونسا نمو کے منہ پر دے مارا وہ لڑکھڑا کے پیچھے ہوا تو میں نے گریبان سے پکڑ کر اُسے اپنے سامنے کیا۔

''تم نے کیا کیا ہے میرے بھائی کے ساتھ؟بولو!''میں دھاڑ رہا تھا۔

''میں نے کچھ نہیں کیا۔وہ ہیں۔۔۔وہی ہیں جو لے گئے اُسے۔۔''نمو نے کہا۔

''نہیں!تم ایسے نہیں بتاؤ گے۔''میں اُسے چھوڑتا تیزی سے اوپر کمرے کی طرف بھاگا۔سامنے میز پر رکھی اپنی پستول اٹھائی،اُس میں گولیاں بھریں،پھر نیچے آیا۔اور یہی میری زندگی کی سب سے بڑی غلطی تھی۔

وہاں پر کوئی نہ تھا۔نہ نمو بابا،نہ اکرم نہ کہ ہی یوسف کی لاش۔فقط میں تھا اور وہ جلتا ہوا لینٹرن۔۔۔

''یوسف!یوسف۔۔۔''میں چیختے ہوئے ہر جانب اُسے دیکھنے لگا۔پر آس پاس کوئی نہ تھا۔میں نے تیزی سے بھاگ کر مرکزی دروازے سے باہر جھانکا۔باہر بھی کوئی نہ تھا۔

''نہیں!نہیں!میرا بھائی۔۔۔وہ نہیں لے جاسکتے اُسے۔''میں اپنے بال نوچ رہا تھا۔

''یوسف۔۔۔یوسف۔۔۔''اپنے چہرے پر تھپڑ مار رہا تھا۔

''ایسا نہیں ہوگا۔میں لے کر جاؤں گا تمھیں یہاں سے۔''میں نے روتے ہوئے کہا۔بادل زوردار انداز میں گرج رہے تھے۔میں نے لینٹرن اٹھایا اور پاگلوں کی طرح بیسمنٹ کی طرف بھاگا۔صبح والے راستے پر پہنچ کر میں نے اُسی دیوار کا رخ کیا۔وہ اب مکمل بند تھی۔یعنی

ہمارے جانے کے بعد کوئی یہاں آیا تھا۔پر مجھے اب کوئی خوف نہ تھا۔مجھے یوسف کی لاش یہاں سے لے کر جانی تھی۔میں نے اپنی پوری قوت لگا کر وہ دیوار وہاں سے ہٹائی، نجانے میرے اندر اتنی طاقت کہاں سے آگئی تھی؟

تمام والو بند کرنے کے بعد میں تیزی سے ایک ایک جوائنٹ ہٹانے لگا۔پھر میں نے وہ خفیہ دروازہ بھی کھول دیا۔جیسے ہی میں لینٹرن لے کر اندر پہنچا، میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔وہ کمرہ جہاں صبح گلے سڑے مردے اور ہڈیاں موجود تھیں، وہاں اب کچھ نہ تھا، لاشوں سے اٹھتا تعفن بھی نہیں۔۔۔

''نہیں! ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔''میں پاگل ہو رہا تھا۔مجھے لگ رہا تھا جیسے میرا دماغ کام کرنا چھوڑ رہا ہے۔

''یوسف۔۔۔یوسف نہیں! میں تمہیں چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔۔۔''میں روتے روتے کہہ رہا تھا۔یکدم ہی میری نظریں سامنے دیوار پر گئیں۔جہاں عجیب و غریب سے نقش و نگار بنے تھے، اور ساتھ کچھ لکھا تھا۔میں تیزی سے دیوار تک گیا اور لینٹرن کی روشنی اُس پر ڈالی۔

''ہمیں سالانہ ایک مہمان کا خون چاہیے ہوتا ہے۔اس بار تیرہواں مہمان، تمہارا دوست تھا''

~بعل

''نہیں! یوسف۔۔۔۔''میں حلق کے بل چیخا۔

''یوسف۔۔۔''اس بار پہلے سے زیادہ زور سے۔

''یوسف!'' باہر بادل گرج اٹھے۔اس بار میری آواز نے عرش و فرش دونوں ہلا دیے تھے۔میں وہیں گھٹنوں کے بل بیٹھتا چلا گیا تھا۔

--------+---------+----------

''تو بتاؤ! کیوں مارا اپنے باپ کو؟''تفتیشی کمرہ نیم اندھیرہ سا تھا۔درمیان میں ایک میز تھی، جس کے عین اوپر بلب روشن تھا۔میز کی دوسری جانب حمزہ بیٹھا تھا، اور اس جانب میں۔میز پر میری پستول رکھی ہوئی تھی، اِسکے علاوہ کمرے میں کوئی دوسری قابل ذکر شے نہ تھی۔

''میں نے انہیں نہیں مارا!''حمزہ نے دانت کچکچاتے ہوئے کہا۔

''ہاں! یعنی کیوں مروایا؟''میں نے الفاظ گھمائے۔

''بات سنو ایس ایس پی! میں تمہیں سمجھا چکا ہوں کہ میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔''اُس نے میری آنکھوں میں دیکھتے خون خوار لہجے میں کہا۔

''تم نے کیا ہے، تم نے ہی کیا ہے۔ تم نے قتل سے کچھ عرصے قبل اپنے باپ سے جائیداد اپنے نام کروانے کے لیے جھگڑا کیا تھا۔''میں نے کہا۔

''نہیں! ایسا نہیں ہے۔''اُسکا لہجہ اب کہ آہستہ ہوا۔''میں بس اپنا حصّہ مانگ رہا تھا۔اور ایسے چھوٹے موٹے جھگڑے ہر گھر میں ہو جاتے ہیں،اِسکا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں اُنکو قتل کر دوں۔''اُسکا لہجہ آخر میں پھر تیز ہوا۔

''اگر ایسا نہیں ہے تو جب تمہارے باپ نے تمہیں کہا کہ اُنکی جان کو خطرہ ہے تو تم پہلی فرصت میں اُنکے پاس واپس کیوں نہیں آئے؟ تم تب بھی اُن سے جائیداد کا مطالبہ کرتے رہے۔ تمہاری کال رکارڈنگ ہم نے حاصل کر لی ہیں۔''

''تم بات کو بلاوجہ غلط رنگ دے رہے ہو ایس ایس پی! میں نے آنے کی کوشش کی تھی، لیکن خراب موسم کی وجہ سے میں نہیں آسکا۔''

''ہاں! لیکن کتنی حیرت کی بات ہے کہ تم اُنکے قتل والے دن ضرور پہنچ گئے؟''میں نے طنزیہ ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔

''نہیں! تم غلط کہہ رہے ہو۔میں نے ٹکٹ بک کروائی تھی پر میں نہیں جا سکا تھا۔اور تم نے دیکھا بھی ہے سی سی ٹی وی میں کہ وہ شخص بہت لمبا تھا۔میں تو چھوٹے قد کا ہوں۔اور وہ پارسل؟ بھلا میں کسی کا خون آلود لباس کیوں بھیجوں گا؟''اُس نے کہا۔

''یہ تو تم بتاؤ گے حمزہ!''میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''تم میرے اوپر غلط باتوں کا الزام لگا رہے ہو۔''وہ پھر چیخا۔

''غالباً تمہارے باپ کو پتہ تھا کہ تم اُسکی جان کے دشمن ہو اور اُس نے اسی لیے تمہیں سی سی ٹی وی کیمرے کے بارے میں نہیں بتایا۔''

''جھوٹ۔۔۔سب جھوٹ۔۔۔''وہ چیخ رہا تھا۔میں اور بھی بہت کچھ کہہ رہا تھا۔اور اگلے ہی لمحے اُس نے میری پستول اٹھائی اور مجھ پر حملہ کر دیا۔

--------+---------+----------

میں باہر آیا تو وہاں کوئی نہ تھا۔ نہ نمو بابا نہ ہی اکرم۔ مرکزی دروازہ کھلا ہوا تھا۔ بارش اور طوفان رک چکے تھے۔ صبح کا سورج صاف آسمان پر روشن ہو چکا تھا۔ میں ساری رات اسی بیسمنٹ میں بیٹھا روتا رہا تھا۔ مرکزی دروازہ کھلا دیکھ کر میں باہر آ گیا۔ پورچ خالی تھا، اسے پار کر کے میں سڑک پر آ گیا۔ پھر گھنٹوں کا سفر پیدل طے کر کے قصبے پہنچا۔ کوئی پاگل ہی ہو گا جو اتنا لمبا چوڑا راستہ پیدل طے کریگا۔ ہاں! میں واقعی پاگل ہو گیا تھا۔ قصبے پہنچا تو ارد گرد کافی چہل پہل تھی۔

''رکو! میری مدد کرو۔۔۔ میرا دوست مر گیا۔ انہوں نے مار دیا میرے دوست کو۔۔۔ اُسکی لاش چھپا دی۔ کوئی پولیس کو بلاؤ۔۔۔ میرا دوست۔۔۔ میرا بھائی! اندر قید ہے۔'' میں چلا چلا کر لوگوں سے مدد مانگنے لگا۔ کوئی میری مدد کو آگے نہ بڑھا، وہ سب میرے ارد گرد اکٹھے ہو کر مجھے افسوس سے دیکھنے لگے پر کہتے کچھ نہ۔

''تم لوگ کچھ کرتے کیوں نہیں! مدد کرو میری!'' میں پھر چیخا۔

''لگتا ہے یہ پاگل ہے۔''

''سنا ہے سامنے آسیب زدہ ہوٹل میں رہنے آیا تھا۔''

''منع بھی کیا ہے ان سر پھروں کو۔ لیکن سنتے کہاں ہیں؟ پہلے بھی اتنے واقعات ہو چکے ہیں۔'' مجمعے میں سے مختلف آوازیں آنے لگی۔ پر کسی نے آگے بڑھ کر میری مدد نہ کی۔ میں اپنے بال نوچتے ہوئے نیچے بیٹھ کر رونے لگا۔ عجیب بے بسی تھی۔

''جنات اسکے دوست کو لے گئے ہوں گے۔ اور اسکو چھوڑ دیا ہو گا باقیوں کی طرح، اور اب اسکا ذہنی توازن بھی خراب ہو گیا ہے۔'' کسی نے کہا تو میں جارحانہ انداز میں اٹھا کر اُسکا گریبان پکڑ لیا۔

''کوئی جنّات نہیں ہیں اندر! میرا دوست ہے وہاں۔ انہوں نے قتل کر دیا اسے۔'' میں چیخنے لگا۔

''ارے پولیس کو فون کرو!''

''یہ پاگل ہو گیا ہے مار دے گا سب کو۔'' کسی نے پولیس کو بلایا۔ پھر سب کچھ جیسے کسی سلو موشن میں ہوا تھا۔ پولیس آئی، اور مجھے اپنے ساتھ لے گئی۔ میں ایف آئی اے آفیسر تھا، اس لیے میری بات پھر بھی سن لی گئی۔ لیکن انکے چہروں سے لگتا تھا جیسے وہ لوگ میری بات پر یقین نہیں کر رہے، اُنکو بھی اس روایتی جنّاتی کہانیوں پر یقین تھا۔

وہ میرے ساتھ ہوٹل گئے۔ نہ کوئی لاش ملی، نہ کوئی ایسی شے جس سے میری بات درست ثابت ہوتی۔ جس کمرے میں، میں اور یوسف ٹھہرے تھے، وہاں بھی کچھ نہ تھا۔ اور پھر مقدمہ بند ہو گیا۔

لیکن میں نے ہار نہ مانی۔ میرے ڈیپارٹمنٹ نے مجھ ذہنی دباؤ اور صدمے کی وجہ سے چھٹی دے دی تھی۔ یوسف کی ماں مجھے دیکھتی تو اسکے بارے میں پوچھتی، اور میں کچھ بھی نہ کہہ پاتا۔ بلآخر میں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ میں اپنے دوست کا بدلہ ضرور لوں گا۔

وہ جون 2009 کی شام تھی۔ جب میں نے اپنا وہ مخصوص سیاہ لباس زیب تن کیا جو میں جاسوسی کے دوران پہنا کرتا تھا۔ اپنے تمام جاسوسی آلات اور ہتھیار ایک چھوٹے سے بیگ میں رکھے اور بنا قدموں کی چاپ پیدا کیے اس ہوٹل کے پچھلے حصے میں آ گیا۔ میں نے سب سے پہلے بجلی کی تمام تاریں کاٹ دیں۔ ہوٹل اندھیرے میں ڈوب گیا۔ میں نے اندھیرے کا فائدہ اٹھایا اور باورچی خانے کا دروازہ جو کہ باغیچے میں کھلتا تھا، اسے استعمال کرتے ہوئے اندر آ گیا۔ پھر سیڑھیوں کے نیچے بنے چھوٹے سے کمرے میں چھپ گیا۔ میری امید کے عین مطابق نمو بابا اور اکرم وہیں ہال میں تھے۔

''میں نے اس یوسف نامی لڑکے کے ساتھ باقی تمام لوگوں کی لاشیں باغیچے میں دفن کر دی ہیں۔ شکر کہ یہ کام پولیس کے آنے سے پہلے ہو گیا۔ ورنہ ان لوگوں نے ہمیں پکڑوا دینا تھا۔'' وہ نمو بابا جو کمر جھکا کر چلتا تھا، جو کبڑا تھا، آج وہ سیدھا کھڑا تھا۔ اکرم بھی سکون سے بیٹھا ہنس رہا تھا۔

''تیرہ لوگوں کا خون ہم نے بعل کو دے دیا ہے۔ اب مزید آٹھ لوگوں کا خون چاہیے۔ ہمیں جلد از جلد یہ کرنا ہو گا۔ پھر بعل ہمیں اس خزانے تک پہنچا دے گا، جس سے ہم طاقتور ہو کر اس سرزمین پر قبضہ کر سکتے ہیں۔'' اکرم نے کہا تو میں نے ضبط سے آنکھیں میچیں۔

''بعل کو خوش رکھنا ضروری ہے۔'' نمو نے کہا۔

''اگر ہم مارنے والوں کے ساتھ آئے ہوئے لوگوں کو بھی مار دیتے تو یہ تعداد کب کی پوری ہو چکی ہوتی؟'' اکرم نے یکدم ہی مایوسی سے کہا۔

''اگر ہم ایسا کر دیتے تو پھر قصبے میں کون یہ مشہور کرتا کہ اس ہوٹل میں آسیب ہے؟ جو بھی آیا اس نے یقین کر لیا کہ یہ سب آسیب ہی کر رہے ہیں۔ وہ تو بس یہ تیرہویں مہمان کچھ زیادہ ہی چالاک تھے۔'' نمو نے کہا۔

''ویسے آپس کی بات ہے، ہے تو آخر بعل بھی جن ہی۔'' اکرم نے کہا تو دونوں ہنسے، میرا دل کیا دونوں کے چہرے سے یہ ہنسی نوچ لوں۔ لیکن فلحال مجھے صحیح وقت کا انتظار کرنا تھا۔

''تم نے بروقت عقل کا استعمال کیا، ورنہ اس یوسف کو مارنا بہت مشکل تھا۔'' اکرم نے کہا۔

''صرف میری عقل ہی نہیں! بلکہ آپکی پھرتی بھی، اگر آپ اُسکی گردن میں وہ سرنج نہ گھونپتے تو وہ نہ مرتا۔''

''اور وہ سرنج لا کر بھی تو تم ہی نے دی تھی۔'' میں مزید یہ گفتگو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر، اپنے لیے کوئی جگہ ڈھونڈنی تھی، جہاں میں چھپ سکوں۔ اس چھوٹے سے دو چھتی نما کمرے میں، صرف ایک چھوٹا سا دیوار گیر چراغ لگا ہوا تھا۔ میں نے اسے تھاما سہ دیکھوں اسے جلایا جا سکتا ہے یا نہیں؟ پر اسی لمحے کچھ ایسا ہوا جس نے میرا دماغ گھما دیا۔ جس دیوار سے میں ٹیک لگا کر کھڑا تھا وہ اپنی جگہ سے سرکتی ہوئی ہٹ گئی۔ میں حیرت کا مجسمہ بنے آگے بڑھا، تو دیکھا کہ وہ کوئی دیوار نہ تھی۔ بلکہ ایک سلائیڈنگ دروازہ تھا۔ جس کا رنگ و روغن اس طرح کیا گیا تھا کہ بادی النظر وہ دیوار لگتا تھا۔ میں نے ٹارچ روشن کیا اور اندر کی جانب قدم بڑھائے۔ میرے اندر داخل ہوتے ہی دروازہ اپنے آپ ہی بند ہو گیا۔ اس اندھیری جگہ پر میں نے ٹارچ کی روشنی ڈال کر دیکھی تو وہاں ایک بہت ہی تنگ سی، بل کھاتی ہوئی سیڑھی اوپر کی جانب جا رہی تھی۔ میں نے اس پر قدم رکھ دیا، میں اوپر چڑھتا، اس ہوٹل کو تخلیق کرنے والوں کے فن کو داد دے رہا تھا۔ جہاں سیڑھیاں ختم ہوئیں، وہاں ایک دروازہ تھا۔ کافی سخت اور بھاری تھا۔ میں نے اسے کھولنا چاہا تو دروازہ لاک ملا۔ میں نے اپنے بیگ سے لاک کھولنے کا سامان نکالا اور چند ہی منٹ میں اُسے کھول لیا۔ پھر میں نے دروازہ کھسکایا اور اندر داخل ہوا۔ اور بس یہی وہ لمحہ تھا جب مجھے سب سمجھ آ گیا۔

وہ دروازہ، جسے میں نے کھولا تھا، وہ درحقیقت اسی کمرے کی دیوار تھی، جہاں میں نے اور یوسف نے قیام کیا تھا۔

میں نے اپنے پیچھے دیوار برابر کی تو کمرے کو دیکھ کر لگا ہی نہیں یہاں کوئی خفیہ راستہ ہو گا۔

''تو اس رات وہ یہاں سے آیا ہو گا۔'' مجھے اپنی اور یوسف کی یہاں گزاری گئی پہلی رات یاد آئی۔ اس روز اُس نے یقیناً ہمیں نشہ آور ادویات دی تھیں، یقیناً اُسکا اثر تھا، ہمارے دماغ اور جسم اس قدر مفلوج تھے کہ ہم سمجھ نہ پائے وہ کہاں سے کمرے میں آیا تھا؟ وہ ہمارے دماغوں میں یہ خوف پکا کرنا چاہتا تھا کہ اس گھر میں آسیب ہے۔

یوسف کو یاد کر کے آنکھیں نم ہوئیں۔ میں نے انہیں جھٹک کر بیگ سے ایک کاغذ نکالا اور نظروں کے سامنے کیا۔ وہ بعل کے متعلق معلومات تھیں۔ یہاں آنے سے پہلے میں نے اسکے بارے میں کافی کچھ پڑھا تھا۔ وہ پرانی کہانیوں میں ایک دیوتا مانا جاتا تھا، لوگ اس کی عبادت کرتے تھے اور اس سے دعائیں مانگتے تھے۔ بدلے میں چڑھاوے کے طور پر اسے سونا، چاندی دیا کرتے تھے۔ ایک روز ایسا ہوا کہ اس میں کچھ شیاطین جنات آسمائے۔ وہ لوگوں سے انسانی خون کا مطالبہ کرنے لگے، جسکے بعد انھیں لگنے لگا کہ اگر وہ اپنے بت کا مطالبہ پورا نہ کریں گے تو وہ اُن پر عذاب لے آئے گا۔ لہٰذا وہ اسے انسانی خون دینے لگے۔ بدلے میں اس نے انھیں مالا مال کر دیا۔

اب میں نہیں جانتا کہ اس کہانی میں کتنی سچائی تھی؟ لیکن ایک بات جو مجھے اس کالم میں سچ لگی وہ یہ کہ آج بھی کچھ جنونی لوگ بعل بت پر یقین رکھتے ہیں، اور انکو خوش کرنے کے لیے انسان کی قربانی دیتے ہیں۔ ایسے بہت سے سائیکو کیسز دیگر ممالک میں پکڑے گئے ہیں۔ اُنکو لگتا ہے ایسا کرنے سے انکا دیوتا خوش ہو جائے گا۔ اور بدلے میں انہیں دھن، دولت و طاقت سے نوازے گا۔ مجھے یقین آگیا تھا کہ نمو بھی اس طرح کا کوئی نفسیاتی ہے۔ اور اسی نے اس جگہ کے بارے میں یہ خبر مشہور کی ہوئی ہے کہ یہ آسیب زدہ ہے۔ تاکہ کوئی اُسکے غلط کاموں میں مداخلت نہ کر سکے۔

میں نے گہرا سانس لیا اور اپنے ساتھ لایا سی ٹی وی کیمرہ نکالنے لگا۔ مجھے اچھے سے معلوم تھا کہ میرے کمرے کی جانب کوئی اور نہیں آنے والا۔ میں نے اپنا سامان ایک کنارے میں رکھا اور دروازہ کھولا لیکن وہ باہر سے بند تھا۔ یعنی مجھے اب آنے جانے کیلئے وہی خفیہ دیوار استعمال کرنی تھی۔

میں اسی خفیہ راستے سے ہال میں آیا۔ پہلے میں نے اچھے سے تسلی کی کہ وہ دونوں سو چکے ہوں، پھر میں نے ایک پاؤں ریلنگ پر رکھا، اور کسی طرح اُس پر چڑھ گیا۔ پھر میں نے ایک مضبوط قسم کے گلو سے ہال کی اوپری دیوار جہاں پر چھوٹے چھوٹے بلب نصب تھے، اُس پر کیمرہ چپکا دیا۔ میرا کام ہو گیا تو میں نے ایک نظر باغیچے میں دیکھا، یہاں میرا دوست یوسف دفن تھا۔

''میں جلد تمہیں یہاں سے لے جاؤں گا یوسف!'' میں نے اس سے وعدہ کیا۔ پھر میں نے واپس جا کر بجلی کی تاریں جوڑیں اور اپنے کمرے میں آ گیا۔ کیمرے کا رخ اس طرح تھا کہ کوئی مجھے آتے جاتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں اب اُن دونوں خبیثوں پر نظر رکھ سکتا تھا۔

جون کی تین تاریخ کو میں صبح صبح ہوٹل کا جائزہ لے رہا تھا۔ اکرم اور نمو میری موجودگی سے لاعلم ہال میں تھے۔ مجھے باغیچے کا ہر زاویے سے جائزہ لینا تھا، تاکہ میں یوسف کی لاش نکال کر لے جا سکوں۔ میں باغیچے میں بنی کیاریوں کا معائنہ کر رہا تھا کہ تب ہی مجھے نمو بابا کی آواز آئی۔ میں فوراً ایک دیوار کی اوٹ میں ہو گیا۔

''حمزہ! تم بات سمجھ کیوں نہیں رہے؟ میں جائیداد ابھی تمہارے نام نہیں کر سکتا؟ تم جانتے ہو ہمیں ابھی بعل کو بہت کچھ دینا ہے۔'' وہ کسی سے فون پر بات کر رہا تھا۔ یہ حمزہ کون تھا؟ اُس وقت میں نہیں جانتا تھا۔

دوسری طرف سے کچھ کہا گیا جسے سن کر نعیم الدّین عرف نمو بابا غضبناک ہوا۔

''یہ تم بعل کے بارے میں ایسا کیسے بول سکتے ہو؟ تم جانتے ہو وہ جلد ہی ہمیں اس سے کئی گنا دولت سے نوازے گا۔ پہلے تو تم نے ہر قتل میں میرا ساتھ دیا تھا۔ اب کیا ہو گیا تمہیں؟'' اُس نے کہا۔ یعنی صرف یہ دو لوگ نہیں؟ ایک تیسرا شخص جسکا نام حمزہ تھا وہ بھی اس قتل میں ملوث تھا۔

''میرے مرنے کے بعد لے لینا جتنی دولت لینی ہے۔'' اُس نے غصے سے کہا۔ ان جیسے لوگوں کو مرنے پر یقین تھا؟ میں طنزیہ مسکرایا۔

''ٹھیک ہے! تم پانچ تاریخ کو یہاں پہنچو، پھر بات ہوتی ہے۔'' اُس نے کہہ کر فون بند کر دیا اور اندر چلا گیا۔ یعنی مجھے پانچ تاریخ سے پہلے یہ سب کرنا تھا۔

میں آہستہ سے اُس محرابی کھڑکی کے پاس گیا اور اندر جھانکا۔ شیشے کے اُس پار ہال میں نعیم الدین عرف نمو بابا کو جھاڑو دیتے ہوئے دیکھا جا سکتا تھا۔ اکرم قریب بیٹھا تھا۔ جیسے ہی نمو بابا کو میری موجودگی کا احساس ہوا، میں فوراً کھڑکی سے دور ہٹ گیا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ خود میں

مبتلاء ہو۔ میں اُسے ویسے ہی مارنا چاہتا تھا جیسے اُس نے باقی سب کو مارا ہے۔ اُس رات میں کسی نہ کی طرح نمو بابا کو ڈراتا رہا۔ کبھی اُسکے کمرے کے باہر سے تیزی سے گزر جاتا، کبھی اُسکے پیچھے سے کوئی شے گرا کر چلا جاتا، کبھی دور کسی کمرے سے اُسکا نام پکارتا، حتیٰ کہ اُسے یقین ہو گیا کہ کوئی اسے مارنا چاہتا ہے۔ حویلی بہت بڑی تھی، اُسکے اچھے خاصے خفیہ راستے میں نے دیکھ لیے تھے، اس لیے اب اس نمو کا کھیل اُسی پر الٹنے میں مزا آ رہا تھا۔ وہ اچھا خاصا خوفزدہ تھا۔ صبح اُس نے اپنے نے فون کر کے بتایا بھی کہ اُسے لگتا ہے کوئی اُسکا پیچھا کر رہا ہے۔

چار تاریخ کی صبح نعیم الدین لکڑیاں لینے جنگل چلا گیا۔ جس روز وہ جنگل جاتا، اُسکی واپسی رات کو ہوتی، رات کے واقعے کے بات نمو کافی حد تک خوفزدہ نظر آ رہا تھا، اُس نے اکرم کو بھی ڈرا دیا تھا لہٰذا اکرم بھی اُسکے ساتھ چلا گیا۔ اب میرا کام آسان ہو گیا تھا۔ پہلے میں نے اچھے سے ہال میں گھوم پھر کر دیکھا، میں نے ایسا جان کر کیا، میں چاہتا تھا کہ میں کیمرے میں آؤں۔ تا کہ آج نہیں، تو کل جب وہ تیسرا شخص جسکا نام حمزہ ہے، وہ واپس آئے تو اُسے ضرور شک ہو کہ یہ سب کسی نے کروایا ہے۔ پھر میں اُسکے سر سارا الزام ڈالوں گا۔ چھوڑوں گا تو میں کسی کو بھی نہیں!

میں نے باغیچے میں وہ جگہ دیکھ لی تھی جہاں کی مٹی تازہ تھی، میں نے اُس جگہ کو چھوڑ کر دوسری جگہ کو کھودا تو وہاں سے وہی تہہ خانے والے مردے دفن ہوئے ملے۔ اُن میں سے دو کے کپڑے میں نے لے لیے، پھر اُنہیں ایک پارسل میں اچھے سے بند کر کے، ایک قصبے کے لڑکے کو چند روپے دے کر پارسل پہنچانے پر راضی کر لیا۔

اگلے روز پانچ جون کو وہ لڑکا پارسل پہنچانے آ گیا۔ میں نے لڑکے کو ہدایت دی تھی کہ پارسل کے ساتھ نمو بابا کو دس منٹ تک مصروف رکھے۔ اتنی دیر میں، میں اکرم کے پاس پہنچا، اور ایک سرنج اُسکی گردن میں گھونپ دی، جیسے اُس نے میرے یوسف کے ساتھ کیا تھا۔ اکرم عرف کامی وہیں نیچے گر کر تڑپنے لگا۔ اُسکو مرنا نہیں تھا، یہ زہر اُس سے اُسکے بولنے، اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت چھیننے والا تھا۔ یہ اُسکی سزا تھی۔ میں اُسے گھسیٹتے ہوئے کمرے تک لے آیا۔ کمرے کی کھڑکی سے مجھے نمو بابا صدر دروازے بند کر کے اندر آتا دکھائی دیا، میں وہیں بیٹھ گیا۔ پھر نمو اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اب وہ پارسل دیکھے گا، اور اُسکے بعد وہ کتنے لمحے صدمے اور بے یقینی میں گزارے گا۔ اتنی دیر میں میرا کام ہو جائیگا۔

میں نے اپنے جاسوسی آلات والے بیگ میں سے ایک ایسا مادہ نکالا، جو کسی بھی فرانزک رپورٹ یا پوسٹ مارٹم رپورٹ میں نہیں آ سکتا تھا۔ اس خاص مادے کو میں نے سیڑھیوں پر لگایا اور وہاں سے ہٹ گیا۔ میں دیکھ سکتا تھا کہ نعیم الدین کسی کو پریشانی میں میسیج لکھ رہا ہے۔ اُس سے پہلے ہی میں نے کھٹکا کیا تو نمو فوراً باہر آیا۔

''تم؟'' مجھے دیکھ کر وہ حیران ہوا۔

''ہاں میں! تمہارا کھیل اب ختم ہوا نعیم الدین!'' میں کہتے ہی اوپر کی طرف دوڑا، تاکہ وہ میرے پیچھے آئے۔ اور ایسا ہی ہوا، اگلے ہی لمحے جب وہ میرے پیچھے دوڑتا ہوا سیڑھیوں پر چڑھا تو درمیان میں اُسکا پاؤں پھسلا اور وہ پلٹ کر گرا۔ میرے حساب کتاب کے عین مطابق اسکا سر سیڑھیوں سے لگا اور وہ وہیں مر گیا۔ میں اُسکے خون پر چڑھ کر چلتے ہوئے نیچے تہہ خانے تک گیا۔ وہاں سے صفائی کا سامان لیا۔ میرے پاس بہت وقت تھا۔ میں نے صرف وہ خون کا نشانات مٹائے جو فوری طور پر نظر آ سکتے تھے۔ میں اس کھیل کو سنسنی خیز بنانا چاہتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ اُسکے بیٹے کو ذرا دیر سے یہ بات معلوم ہو۔ وہ اُس قاتل کا سوچ کر خوفزدہ رہے جس نے اُسکے باپ کو مارا تھا۔ بالکل ویسے ہی خوف زدہ رہے جیسے اُس نے اپنے ہوٹل آنے والوں کے ساتھ کیا۔

اُسکے بعد میں نے احتیاطاً سیڑھیوں پر لگا مادہ بھی صاف کر دیا تاکہ ابتدائی تفتیش میں کسی کی نظریں نہ جائیں اُس پر۔

پھر میں باہر آیا اور باغیچے میں بنی اُس چھوٹی کیاری کو کدال کی مدد سے کھودنا شروع کیا۔ یہ بہت ہمت کا کام تھا، میرے ہاتھ کانپ رہے تھے اور آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ بلآخر کچھ لمحوں بعد مجھے یوسف کی لاش نظر آ گئی۔ لاش کی حالت زیادہ خراب نہیں ہوئی تھی۔ میں نے لاش باہر نکالی، یوسف کا سر اپنی گود میں رکھا۔ اُسکی بند آنکھوں پر ہاتھ پھیرا اور کہا۔

''مجھے معاف کر دینا میرے دوست!'' پھر میں اُسکے ماتھے پر سر ٹکائے پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ کچھ دیر رو لینے کے بعد میں نے اُسکی لاش کو ایک چادر میں لپیٹا اور وہی پارسل جو اندر تھا اُسے بند کر کے یہاں لایا، اور کیاری میں دفنا دیا۔ میں اس کھیل کو مزید سنسنی خیز بنانا چاہتا تھا۔ پھر میں نے یوسف کی لاش اٹھائی، اپنا تمام سامان لیا اور حویلی کے پیچھے بنے جنگل میں پارک کی ہوئی اپنی جیپ میں اُسے ڈال کر واپس شہر آ گیا۔

شہر آکر میں نے یوسف کی والدہ کو اُنکی لاش دکھائی، اور اُن سے وعدہ لیا کہ وہ کسی کو کچھ نہیں کہیں گی۔ میں جانتا تھا کہ اگر میں لاش وہاں چھوڑ دیتا، تو جب حمزہ پکڑا جاتا تو سب سے تازہ لاش ہونے کی وجہ یوسف کا ہی پوسٹ مارٹم کیا جاتا، میں مزید اُس کی بے حرمتی نہیں چاہتا تھا۔اس لیے خاموشی سے اُسکا جنازہ پڑھ کر اُسکی تدفین کر دی۔

میں نے اپنے دوست کا بدلہ لے لیا۔

اور دوستی کا حق ادا کر دیا۔

--------+---------+----------

''میں نے اپنے دوست کا بدلہ لے لیا۔اور دوستی کا حق ادا کر دیا۔'' میں نے مسکراتے ہوئے حمزہ کو ساری کہانی سنائی۔

''تم۔۔۔ایسا نہیں کر سکتے۔۔۔۔ تم جھوٹ بول رہے ہو۔'' اُس نے بے یقینی سے مجھے دیکھا۔

''یہ سچ ہے۔ بالکل سچ!'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''مجھے لگتا تھا کہ تم جلد یہ جان لوگے کہ تمہارا باپ قتل ہوا ہے۔پر تم نے مجھے مایوس کیا۔ چھ مہینے لے لیے تم نے۔''

''جھوٹ۔۔۔ جھوٹ ہے یہ۔۔۔ تم ایسا کیسے کر سکتے ہو؟''

''پھر جب میں پہلی بار تمھارے ہوٹل یعنی تمہارے باپ کی حویلی آیا تفتیش کے لیے، تب میں نے اکرم عرف کامی کو دیکھا۔ وہ مجھے پہچان رہا تھا۔ حالانکہ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔اسی لیے میں نے دوبارہ وہاں آکر دیکھا۔اُسکا انداز دیکھ کر لگتا تھا جیسے وہ مجھے پہچان رہا ہے۔ میں نے جان کر کیاری کھودنے کی تجویز دی، تاکہ تمہارے چہرے پر خوف کا تاثر آئے اور وہ میرے علاوہ باقی لوگ بھی دیکھیں، کیونکہ تم جانتے تھے کہ باغیچے میں لاشیں دفن ہیں، کے تمہارے لیے کیاری کھودنے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ میں ہر طرح سے شک تم پر ڈالنا چاہتا تھا۔ اور میں کامیاب ہوا۔'' میں مسکرا رہا تھا۔''اور تابوت میں آخری کیل اکرم کی گواہی نے ٹھونک دی۔ گو کہ وہ اشارہ میری طرف کر رہا تھا، لیکن چونکہ تم میرے سامنے تھے، اور سب کا شک پہلے ہی تمہارے اوپر تھا لہٰذا سب کو لگا کہ وہ تم پر اشارہ کر رہا ہے۔''

''جھوٹ۔۔۔سب جھوٹ۔۔۔''اُس نے چیختے ہوئے میری پستول اٹھائی جو میں نے جان کر رکھی تھی۔اور اُس نے مجھ پر حملہ کر دیا۔اُس نے پہلی گولی چلائی، میں اچھل کر دوسری جانب ہوا۔

''بچاؤ! مجھے بچاؤ!''میں جان کر باآواز بلند چیخنے لگا،تاکہ سب جمع ہوں اور دیکھ لیں کہ اُس نے مجھ پر حملہ کیا ہے۔اُس نے میرے اوپر دوبارہ پستول تانی، اُسی لمحے میں نے اُسکا ہاتھ پکڑ لیا۔ پیچھے دیگر عملہ جمع ہو چکا تھا۔یعنی میرے عینی شاہد موجود تھے۔

یہ گو کہ ایک بہت بڑا رسک تھا۔پر مجھے یہ کرنا تھا۔اُس نے ٹریگر پر ہاتھ رکھا ہوا تھا،اور میں نے اُسکا وہی ہاتھ پکڑ کر اُسے روکا ہوا تھا، پھر میں نے اُسکا ہاتھ پکڑ کر موڑا اور پستول کا رخ اُسی کے سینے پر کر دیا۔عملے کی جانب میری پیٹھ تھی، لٰہذا وہ دیکھ نہیں سکتے تھے کہ میں نے پستول کا رخ موڑ دیا ہے۔

''تمہارا کھیل ختم!''میں نے سرگوشی نما آواز میں کہا اور ٹریگر پر رکھی اُسکی انگلی دبا دی۔اگلے ہی لمحے ہم دونوں جھٹکے سے ایک دوسرے سے الگ ہوتے الگ الگ سمتوں میں زمین بوس ہوئے۔

میں دیکھ سکتا ہوں کہ عملہ ہماری جانب بڑھ رہا ہے۔اور حمزہ کے سینے سے خون بہہ رہا ہے۔جبکہ اُسکا وجود بن پانی کی مچھلی کی طرح تڑپ کر ساکت ہو چکا ہے۔

عملہ مجھے سہارا دے کر اُٹھا رہا ہے۔یہ سب جانتے ہیں کہ میں نے اپنے دفاع میں حمزہ کا قتل کیا ہے،ورنہ میرا ایسا کوئی ارادہ نہ تھا۔

اور ویسے بھی، شیراز شک کی بنا پر باغیچے میں بنی کیاریوں کی مزید کھدائی کروانے گیا ہے۔یقیناً اب تک اُسے دیگر لاشیں بھی مل چکی ہوں گی۔اور میں؟

میں ان سب سے بری الزمہ ہوں۔

کسی کا شک مجھ پر نہیں ہے۔

--------+---------+----------

ختم شد